اولڈ بوائے
علی گڈھ

اولڈ بوائے

جلد ۱ — نمبر ۲

علیگڈھ اولڈ بوائز کا ادبی، تاریخی، تعلیمی اور تفریحی ماہ نامہ

فہرست مضامین بابت ماہ نومبر ۱۹۲۷ء

نمبر	مضمون	مضمون نگار	صفحہ
۱	بزرگ داشت	جناب مولوی ہارون خاں صاحب شروانی بی۔اے (آکسن)	۳
۲	سنسکرت ادب	" نواب سید نصیر حسین صاحب خیال	۷
۳	شرح دیوان غالب پر ایک نظر	" مولوی سید محمد ضامن صاحب کنتوری	۱۱
۴	شمع	" عبدالرزاق صاحب بسمل	۱۶
۵	کار مرداں	" آزاد سہارنپوری	۱۷
۶	کاریگروں اور میکانکل انجنیروں کی ضرورت (ترجمہ)	" مولوی نذیر الدین صاحب ایم۔اے	۱۸
۷	تنا سا مرضیا	" سید وزیر حسن صاحب	۲۵
۸	یاد ایام	" وفا	۳۰
۹	اولڈ بوائز		۳۳
۱۰	خزینۃ الکرام		۴۱
۱۱	ماو شما		۴۳
۱۲	اولڈ بوائز ڈنر		۴۷

سید منظر علی اشہر مدیر و ناشر نے ۴۰۱۲ سلطانپورہ حیدرآباد دکن سے شایع کیا

قیمت سالانہ عہ — قیمت ششماہی ہے

مکرمی! السلام علیکم

کل الطاف نامہ ملا۔ اس سے پہلے منظر الکرام نظر نواز ہوا تھا۔ رسید لکھنے کا ارادہ کر لیا تھا، دوسرے مشاغل کی وجہ سے ذہن سے اتر گیا۔ شرمندہ ہوں اور عذر خواہ۔ رسالہ بہت اچھا ہو گیا۔ رسالہ کیوں کہوں، کتاب کیوں نہ کہوں۔ کام حوصلہ شکن تھا، آپ کا استقلال کام کر گیا۔ ایک یادگار چیز ہاتھ آگئی۔ جن لوگوں کا ذکر ہے اُن کو دہرا ممنون ہونا چاہیے، آپ کی محنت کا، محبت کا۔ محنت سے احوال فراہم کئے۔ محبت سے ذکر کر کے نام نیک کا سامان بہم پہنچایا۔ میرا دلی شکریہ بہت بہت قبول فرمائیے۔

قیمت معلوم ہو تو کچھ جلدیں کتاب خانوں کیلئے خرید لی جائیں۔

امید منزل۔ ۵ نومبر ۱۹۲۶ء نیازمند ..... صدر یار جنگ

خدمت مکرمی مولوی سید منظر علی صاحب مدالطافہ

جس وقت ہمارا اکتوبر نمبر طباعت کی منزلیں طے کر رہا تھا ہمیں برادر عزیز مولوی ہارون خان صاحب شروانی بی۔ اے (آکسن) کی تحریر مورخہ ۲۲ ستمبر وصول ہوئی۔ موقع ہوتا تو ہم اس کو اکتوبر نمبر ہی میں شائع کر دیتے۔ مگر اب تاخیر کے لئے عذر خواہ ہو کر باعتبار اہمیت اولڈ بوائے کا سرنامہ قرار دیتے ہیں۔ ہم اہل ایشیا "بزرگداشت" میں دنیا کی کسی قوم سے پیچھے نہیں ہیں؛ پھر بھی ہمیں اپنے بزرگوں علی الخصوص اُن لوگوں کے لیے ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے جو ساری عمر ہماری تعلیم و تہذیب کے لئے کوشاں رہ کر اب زیر خاک آرام کر رہے ہیں۔ سرسید کی دلی تمنا ایک جھونپڑے کو محل بنانے اور ایک چھوٹے سے مدرسہ کو یونیورسٹی تک پہنچانے کی ساری عمر رہی۔ اُن کی یادگار میں محبانِ تعلیم نے سعی کی، اور ہماری یونیورسٹی بحالت موجودہ جیسی کچھ ہے، قائم ہو گئی۔ سرسید کے رفقاء کار کے لئے ہم نے کیا کیا؟ اسکا جواب راقم الحروف کے پاس کچھ نہیں ہے، اور نہ اس مسئلہ سے ہمیں اس وقت کوئی شخصی واسطہ ہے۔ البتہ متمدن دنیا کی روش اگر ہمیں منظور ہے تو ہمیں اپنے بزرگوں کی یاد بھی ایسی ہی تازہ رکھنی چاہئے جیسی کہ ان کی شان کے شایاں ہو۔ مسٹر شروانی کی تحریک معقولیت کو لئے ہوئے ہے، اور اس قابل ہے کہ ہم سب مل کر اس پر غور کریں، اور آخر میں کسی نتیجہ پر پہنچکر اس کو عملی جامہ پہنائیں۔ اس باب میں ہم اپنے ناظرین سے بطور خاص درخواست کرتے ہیں کہ اپنی اپنی رائے سے ہمیں اطلاع بخشیں۔

اولڈ بوائے

بخدمت جناب مدیر رسالہ "اولڈ بوائے" حیدرآباد دکن

جنابِ من!

دو سال بیشتر مسلم یونیورسٹی علیگڈھ کا جشن پنجاہ سالہ دامن مستقبل میں پنہاں تھا۔ آج وہ ایک واقعہ ماضیہ ہوگیا ہے، اور اس کے کیفیات و نتائج آشکارا ہوگئے ہیں۔ بعض ناگزیر اسباب کی وجہ سے میں حیدرآباد سے جا نہ سکا، اور اس میں شرکت کی امنگ گویا دل کی دل ہی میں رہ گئی۔ لیکن گو میں خود اس مبارک جلسہ کی صحبتوں اور چند در چند مشاغل سے بہرہ اندوز و محظوظ نہ ہوسکا، تاہم چونکہ علیگڈھ میری مادر علمی ہونے کے ساتھ ساتھ ضلع پیدائش بھی ہے، اس لئے میں نے اس جشن کی کارروائیوں کی روئداد کو نہایت درجہ غور و فکر سے مطالعہ کرنے کی کوشش کی۔ ان کیفیات کے مطالعہ، اور ان احباب کی زبان سے، جو اس میں شریک ہوئے تھے، وہاں کے حالات سننے سے میرے دل پر یہ اثر ہوا، کہ اس جشن کا پیش نامہ (پروگرام) بہت کچھ چہل پہل، بہت سی دعوتوں اور عصرانوں، اور متعدد استقبالی و صدارتی تقریروں سے مملو تھا! لیکن ساتھ ہی ایک بات جو قابلِ لحاظ معلوم ہوتی ہے، یہ تھی کہ باوجود اس مصروفیت (یا یوں کہئے کہ بوجہ اس مصروفیت) کے اس مادر علمی کے پنجاہ سالہ جشن کے مبارک موقعہ پر کوئی حقیقی علمی کام انجام کو نہیں پہنچایا گیا۔ اس کی کیفیت بعینہٖ اس دوستانہ دعوت سی ہوئی، جس میں لطف صحبت بھی ہو، اور انواع و اقسام کے کھانے پینے کی چیزیں بھی موجود ہوں، لیکن جس کی یاد مرورِ ایام سے رفتہ رفتہ محو ہوتی جاتی ہو، اور لطف صحبت اور لذتِ طعام دونوں کم و بیش بے نتیجہ ثابت ہوئی ہوں۔ کیا اچھا ہوتا اگر اس جشن میں ایک عظیم الشان تعلیمی ادارے کی پچاسویں سالگرہ منانے کے سلسلہ میں کچھ ایسے اسباب فراہم کئے جاتے جن کا کوئی مستقل علمی نتیجہ نکل سکتا۔ مجھے یاد ہے کہ جب ۱۹۰۸ء میں کرائسٹ کالج کیمبرج نے اپنے مایۂ ناز فرزند جان ملٹن کی سہ صد سالہ سالگرہ منائی ہے تو ارباب کلیہ نے چار دانگ عالم سے اپنے جلیل القدر شاعر و نثار کی تصاویر، تحریرات، خطوط، تصنیفات کی ابتدائی اشاعتیں، غرض ہر قسم کی موجودہ یادگاروں کا ذخیرہ جمع کیا تھا، اور اس نایاب مجموعہ کی زیارت کی غرض سے اکناف عالم کے قدردان کیمبرج آئے تھے۔ اسی طرح جو لوگ جرمانی علوم و فنون کی ترقی سے باخبر ہیں، وہ یہ جانتے ہیں کہ جب کسی معروف جرمانی عالم کی

خدمت علمی کی پچاسویں یا ساٹھویں سالگرہ منائی جاتی ہے تو اس کی مخصوص شاخ علمی کے جتنے بھی ماہر یا مبصر ہوتے ہیں وہ اس علم کی کسی نہ کسی صنف پر محققانہ مضامین لکھتے ہیں، اور اس مجموعہ کو اس عالم کے نام نامی پر معنون کیا جاتا ہے۔ اسی طرح حال میں جامعہ کلکتہ کے بانی دوم آشوتوش مکرجی کی یادگاری طور پر ایک علمی کتاب شائع کی گئی ہے جس میں بڑے متبحر بنگالیوں اور غیر بنگالیوں نے اُن شاخہائے علمی پر مضامین لکھے ہیں، جو صاحب عنوان کو مرغوب تھے۔

ہم ہندوستانیوں میں عموماً اور مسلمان ہندوستانیوں میں خصوصاً یہ بڑی کمزوری ہے کہ اپنے اسلاف کی یادگاریں برقرار رکھنے میں بعض مرتبہ بہت کچھ کوتاہی برتتے ہیں، جس کے باعث نہ صرف ہماری خودداری کے احساس میں کمی رہ جاتی ہے، بلکہ باوجود اپنی درخشاں تاریخ، اور اپنے اسلاف کے چمکیلے کارناموں کے، ہم نہ تو اغیار کو مغلوب کر سکتے ہیں، اور نہ خود کما حقہٗ سبق لے سکتے ہیں۔

سرسید علیہ الرحمہ کو اس دنیا سے گئے کچھ زیادہ عرصہ نہیں گذرا، لیکن ہم میں کتنے ایسے ہوں گے جو اُن کی زندگی کے حالات سے واقف ہوں، یا جنہوں نے اُن کی تعلیم کو سمجھنے کی کوشش کی ہو! اگر علیگڈھ کے ا۔ب جامعہ اس مقصد کو پیش نظر رکھکر سرسید علیہ الرحمہ اور اُن کے جلیل القدر ہم نشینوں کی (جنہوں نے اس مدرستہ العلوم کی داغ بیل ڈالی تھی) یادگاروں کی ایک بڑی نمائش منعقد کرتے، اور اشتہار دے کر، ذاتی ترغیب کے ذریعہ سے، اور قیمتاً، ابتدائی مدرسہ کے نقشے، بانیوں کی تحریریں، ہمعصر اخبارات کے اقتباسات، اور ہمعصر تصاویر، نوشتے، خطوط وغیرہ فراہم کرتے، تو یقیناً اس مادر علمی کی فلاح کے لئے مناسب ہوتا۔

بہر طور پنجاہ سالہ جشن تو گزر چکا، اب غالباً سات آٹھ سال کے بعد تحریک علیگڈھ کی ساٹھویں سالگرہ منائی جائے گی۔ ہم جانتے ہیں کہ علیگڈھ نے مختلف شاخہائے علمی کے دلدادہ، اور مختلف عملی میدانوں کے مرد پیدا کئے ہیں۔ تاریخ و معاشیات، طبیعیات و کیمیا، منطق و فلسفہ، ریاضی و ہندسہ، سیاسیات و حکومت، زمین داری و ملازمت، مضمون نویسی و ادارت، رہبری و تقلید، آزادی و غلامی، غرض شاید ہی کوئی شعبہ ایسا ہوگا، جس میں انہوں نے اپنے ہم چشموں کا کم سے کم مساوی رتبہ حاصل نہ کر لیا ہو۔ کیا یہ ناممکن ہے کہ ابھی سے ایک ایسی علمی مجلس ترتیب دیجائے جو چند موضوعات پر مستقل تفحصی مضامین لکھوانے کا انتظام کرے، اور اُن مضامین کو ایک جلد یا متعدد جلدوں میں یکجا کر کے آئندہ جشن کے موقعہ پر شائع کر دیا جائے۔ ابھی

ہمارے سامنے سات آٹھ سال کا زمانہ ہے، اور کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی کہ ہماری سعی کیوں بارآور نہو، یہ مضامین ایک مادرعلمی کے جشن کی ایک علمی یادگار بن سکتے ہیں۔ یہ دنیا کے سامنے اس امر کا ثبوت ہوگا کہ علیگڈھ والے محض کھیل تماشے کے ہی شائق نہیں، بلکہ ان میں مفید علمی مذاق بھی موجود ہے۔

اِمسال دسمبر کے آخری ہفتہ میں کانگرس ......، اور مسلم تعلیمی کانفرنس جیسی جلیل القدر تنظیمیں اپنے سالانہ اجلاس مدراس میں منعقد کریں گی، جس کے باعث یہ اُمید ہے کہ ہرخیال کے اولڈبوائز، اس شہر میں جمع ہوں گے۔ ان قومی جلسوں کے سلسلہ میں ایک مجلس شوریٰ ان معلموں اور ادیبوں کی منعقد ہونی چاہیئے؛ جن کا کبھی نہ کبھی علیگڈھ سے تعلیمی تعلق رہا ہے۔ اگر اس طرف ذرا بھی التفات کی گئی تو یقین ہے کہ بہت سے مراحل طے ہوجائیں گے، اور ۱۹۲۲ء کی ابتدا سے علمی کام شروع ہوسکے گا۔ اس مجلس کا کام یہ ہوگا کہ وہ ارباب علم کی ایک مختصر سی پنچایت مقرر کرے، جو موضوعات اور مضامین کے حجم کا تصفیہ کرکے ایک ایک موضوع ایک ایک عالم کے تفویض کردے۔ اس مرکزی جماعت کا ایک معتمد بھی مقرر ہونا چاہیئے، جو مجموعہ مضامین کی ترتیب کا ذمہ دار اور (اِس جماعت کی ماتحتی میں) رسالہ یا رسائل کا مدیر بھی ہو۔ بہرحال یہ فروعی اُمور ہیں اور بروقت حسب ضرورت طے ہوسکتے ہیں۔ یہ امر خاص طور پر قابل لحاظ ہے کہ چونکہ یہ کام مسلم یونیورسٹی کے حقیقی کارناموں کی اشاعت پر مشتمل ہوگا، اور اس میں بالخصوص اس کی فلاح وبہبود مضمر ہوگی، اس لئے موجودہ ارباب علیگڈھ کی پشت پناہی کے بغیر اس میں حقیقی روح نہیں پڑسکتی۔ میں ہرایک اولڈبوائے سے جس کے دل میں اپنی مادرعلمی کا درد ہے، استدعا کرتا ہوں کہ براہِ کرم طرزِ کار کی بابت اپنی رائے عالی سے مطلع فرمائیں، تاکہ اگر اس کام کی اہمیت کا احساس ہو تو اُس کی داغ بیل جلد از جلد ڈالدی جائے۔ فقط

ازجامعہ عثمانیہ
حیدرآباد دکن

ہارون خاں شروانی

سنسکرت ادب

داستانِ اردو کے حال، اور محترمی نواب خیال کی اس بےمثل تصنیف سے دنیائے ادب بخوبی واقف ہے۔ اس داستان کا ایک ضروری باب "اردو کا دوسرا دور (یا اردو دکن میں)" ہمنے اپنے رسالہ لسان الملک میں فخر کے ساتھ شائع کیا تھا۔ اس کے بعد علیگڈھ کے مشہور رسالہ سُہیل میں اس کے دو باب "غیر آریا و آریا" شائع ہوئے ان میں ان دو قوموں کے ہند میں قیام، اور ان کی معاشرت و تہذیب (سویلیزیشن) اور ان کے ادب کا تفصیلی طور پر ذکر کر کے سنسکرت کے عروج و زوال کا نقشہ کھینچا گیا؛ اور اس ملک کی اصلی زبانوں، یعنی بھاشا، خصوصاً برج بھاشا کا دلچسپ قصہ سنایا گیا تھا، جو آگے چل کر اردو بنی۔ آریا کے ذکر خیر میں اُن کے علوم و فنون، اور اُن کے لاجواب ادب کا بیان اس داستان میں دیدنی ہے۔ مہابھارت و رامائن کا خلاصہ جس اسلوب سے پیش کیا گیا، حق یہ ہے کہ حضرت خیال کے سوا کسی دوسرے قلم سے اُس کی تصویر اترنا مشکل ہے۔ ان دو مثنویوں کے ذکر کے بعد سنسکرت کی اور مشہور تصنیفوں، اور اس زبان کے ڈراموں کا ذکر بھی ضرور تھا۔ سُہیل میں اس کمی کو محسوس کر کے ہم نے اپنے مخدوم سے اس کا سوال کیا۔ انہوں نے بکمال مہربانی، اس مضمون کا وہ حصہ ہمیں مرحمت فرمایا ہے، جسے اس بیان کا تتمہ کہا جا سکتا ہے۔ ہم اس کو نہایت مسرت کے ساتھ اولڈ بوائے میں درج کر کے اس کے شائقین سے ملتمس ہیں کہ وہ ہمارے ادیب الملک کی سحر نگاری پر بطور خاص نظر کریں، اور سکنتلا کے سے ناٹک کے خلاصہ کو پڑھ کر ہماری زبان کے اس کالیداس کے ادب و انشا پر سر دُھنیں!

...............اولڈ بوائے

مہابھارت اور رامائن کی سی تصنیفوں کے بعد ممکن نہ تھا کہ ملک وقوم کی حالت نہ بدلتی، اور اُن میں اہلِ قلم پیدا نہ ہو جاتے۔ یہ اُن لاجواب مثنویوں ہی کا اثر تھا کہ آخر یہاں قسم قسم کی نظمیں شروع ہو گئیں۔ سنسکرت اور اُس کے وقت کی بھاشا جو طبقۂ اوسط کی زبان تھی، دونوں میں ادیب وشاعر اپنی طبیعت کا زور دکھانے، اور خاص وعام کو بھانے لگے۔ ناٹک (ڈراما) بھی اُسی دَور کے باغ ادب کا وہ میوہ ہے جو اب بھی تازہ ہے۔ گو یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ دراصل کس زمین پر اس کا قلم لگایا گیا، مگر ویدوں میں اِس پھل کا ذکر موجود، اور نٹ کا جا بجا مذکور ہے۔ یہ گویّے اور اُن کے ناٹک یہاں بہت عام اور مرغوب تھے۔ امیروں کی محفلوں اور راجاؤں کے درباروں تک بھی ان کی رسائی تھی؛ اس وجہ سے ملک میں اس (ناٹک) کی آواز بہت بلند رہی۔

اسی سنسکرت دور میں کالیداس پیدا ہوئے۔ یہ بکرماجیت کے مشہور نورتن کے وہ جوہر ہیں، جس کی چھوٹ آج تک پڑتی، اور نظر کو خیرہ کرتی ہے۔ اُن کی رِتو سنہارا (بارہ ماسا) اور میگھادوتا (قاصدِ ابر) کی سی سوہنی نظمیں، اِس زمین پر برس پڑیں، اور زبان اور گلوں کے رستہ سے ملک پر چھا گئیں۔ پھر رگھوبنسا تصنیف کی۔ اس میں رگھو (رامچندر جی کے مورث) کے بنس (خاندان) کا مفصل حال لکھا۔ لیکن جس خاص چیز نے ہمارے اس ملکی شاعر کو الہامی منوا دیا، وہ اُن کا لاجواب ڈراما شکنتلاَ ہے۔

یہ قصہ ایک راجہ کے رنواس (محل) سے شروع ہوتا، اور ایک غریب کی جھونپڑی میں ختم ہوتا ہے۔ وشنتو کمار اتفاقاً ایک جنگل میں جا نکلتے ہیں، اور وہاں سکنتلاَ نام ایک پریزاد برہمنی پر عاشق ہو کر اُس سے بیاہ کر لیتے ہیں۔ کچھ دن وہاں رہنے کے بعد انھیں اپنا راج یاد آتا ہے، اور سکنتلا کو اپنی نشانی کا چھلا دے کر اور پھر ملنے کا وعدہ کر کے رخصت ہوتے ہیں۔ اُدھر کمار گھر پہنچ کر جنگل کا قصہ اور اپنی سکنتلا کو بھول جاتے ہیں، اِدھر اس غریب کے یہاں لڑکا پیدا ہوتا ہے، جسے وہ بڑے دُکھوں سے پالتی، اور وشنتو کی یاد میں دن گزارتی ہے۔ بہت دن بیت گئے۔ جنگل بڑھا، کٹا چھٹا، صاف ہوا، اور پھر بھرا۔ آس پاس کھیت لہلہائے، مرجھائے، اور پھر اٹھائے اور لگائے گئے۔ گاؤں کا تالاب بھرا، سوکھا، پانی پڑا، اور پھر

ہاتھی ڈوب ہوگیا۔ اس کے کنارے کنول پھوٹے، نکلے، اور پھولے۔ بھونرے بھن بھن کرتے اڑے، دوڑے، متوالے، چکراتے، چکر کاٹتے اس کے پھول پر مدہوش بیہوش گرے، اور وہیں ڈھیر ہوگئے۔ سکنتلا قدرت کے یہ تماشے دیکھتیں، اور کنول اور بھونرے کی کوشش اور وفا پر سر دھنتیں، اور اپنے وشنتو کی یاد میں ڈوب جاتیں۔ بچہ پلا، بڑھا، کھیلنے لگا، اور اب ہشیار ہوگیا۔ یہ سب ہوا، مگر کمار اب بھی نہیں لوٹے!

یہ بہت اکتائیں تو خاوند کو ڈھونڈنے نکلیں۔ بخت کی خوبی، ستارے کی گردش، لو وقت پریشانی کا چھلا بھی گم ہوگیا! روئیں کہ اب کیا لے کر اور کس منہ سے کمار تک جائیں۔ مگر ہمت نہیں ہاریں۔ دل کڑا کر کے لڑکے کا ہاتھ پکڑ چل نکلیں، اور کسی طرح راجہ کے دربار تک پہنچیں۔ وشنتو نے نہیں پہچانا۔ لڑکا پیش کیا گیا، اُسے بھی غیر جانا۔ بہت کچھ یاد دلایا گیا تو ذرا چیتے، مگر اپنا چھلا مانگا۔ وہ کہاں! سکنتلا بھرے دربار میں جھوٹی بنیں۔ نکلیں، لیکن صبر کیا، اور اسی شہر میں رہنے لگیں۔ کچھ دن بعد وشنتو جی چونکے۔ غریبوں کی یاد آئی، بلاہٹ ہوئی۔ دن پھر چکے تھے، لیجئے وہ نشانی بھی مل گئی! سکنتلا ہنستی کھیلتی دربار کو چلیں، پہنچیں، راجہ کے سامنے آئیں۔ کشش ہوئی، پہچانا۔ مگر وشنتو پھر راجہ ہیں۔ سنبھلے رہے اور اپنی نشانی کا سوال کیا۔ اب سکنتلا نے مسکرا کر وہ چھلا پیش کر دیا۔ راجہ بیچین ہوکر گدی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ جوش میں انکا ہاتھ پکڑ کر بغل میں بٹھالیا۔ لڑکا سامنے آیا۔ دیکھا اور محبت کی نظر نے اُسے گود تک پہنچا دیا۔ پیار کیا، بھرت نام رکھا۔ بچھڑے ملے، اور پھر ہنسی خوشی رہنے لگے! یہ وہی بھرت ہیں جو بڑھ کر بھرت جی کہلائے، اور یہ چندربنسیوں کے پرکھے[1] اور اس بنس کے بانی مانے گئے۔

یہ نادر ڈراما بھی اُس وقت کے پنڈتوں کی زبان، یعنی سنسکرت میں ہے، مگر چونکہ اس کی سبھا میں راجہ پرجا، عالم جاہل، اور خاص وعام سب آتے، اور یونانی کنیزیں تک ناچتی اور ایکٹ کرتی ہیں، اس سے اس کے خاص ایکٹروں کی زبان تو دیوبانی ہے، مگر اوروں کی بولی وہی پراکرت ہے جو اس وقت کے بزار کا رائج سکہ اور پرجا کے گھروں کا کھرا مال تھا۔ اس سے ظاہر ہے کہ کالیداس کے سے جوہری کو بھی

---

[1] پرکھہ۔ بزرگ، بھوت۔

یہاں کے اصلی وملکی سنگریزوں کو اپنے ذخیرہ میں جگہ دئے بغیر چارا اور چھٹکارا نہ تھا! یہ نظمیں اور یہ تصنیفیں گھر گھر پھیلیں، اور خواص پر عوام کی بولی، اور عوام پر خواص کی زبان کا اثر پڑتا اور بڑھتا چلا۔

مرچھ چھکاٹی (رتنہ کھلونا) کا سا ناٹک بھی اُسی زمانہ کی یادگار، اور قصور وار کو پکڑنے اور بے قصور وار کو چھوڑنے کا جائز وفطری قانون سکھا کر، انسان کو منصف بناتا، اور خدا کو یاد دلاتا ہی۔

پھر نل دمن (نل ودمنتا) کی سی مثنوی لکھی گئی۔ اس میں ایک جواری راجہ (نل) کی مدہوشی، اور اندھے جوے کی پُر درد داستان، اُن کی بے پناہ ہار...... راجہ نل سلطنت ہی ہارا...... اور اُن کی رانی دمنتا کی وفا وہشیاری کی حکایت سنا کر بڑے سبق دئے گئے ہیں۔ یہ وہی دلچسپ ومفید نظم ہے جسے فیضی کے سے علامہ نے اکبر کی فرمایش پر فارسی کا جامہ پہنایا، اور ہم سے روشناس کرایا، اور اس کی اسی مثنوی (نل دمن) نے شہزادوں اور امیروں کا جُوا چھڑایا۔

پنچ تنترا بھی اُسی مبارک دور کی ایک نئی، مزیدار، مسلسل اور قصہ در قصہ حکایت ہی۔ یہ جانوروں کی ایک بولتی ہوئی تصویر ہی۔ مگر کیسے جانور اور کیسا ہوش رُبا قصہ! یہ اُن طلسمی بے زبانوں کی وہ جادو بھری کہانی ہی، جو اُن کی زبانی آدم ذات (زاد) کو سنائی جاتی، اور باتوں باتوں میں اُسے انسان بناتی ہی! یہ قصہ نہ صرف اس ملک میں عام ہوا، بلکہ اس کا چرچا دور دور پھیلا۔ پہلوی میں بھی وہ حیوان گویا ہوئے، اور کلیلہ ودمنہ کی زبان سے وہ عرب میں بھی ناطق سمجھے گئے۔ پھر نئے فارس اور نئی فارسی کے آسمان شہرت پر وہ ملا حسین واعظ کے قلم سے انوار سہیلی بن کر چمکا، اور بعد کو اکبر کے سے ہوشمند کے اشارہ پر ہندی فارسی کا خلعت اور عیار دانش کا لقب پاکر ہماری مغل کو بھی خرد افزا بنانے، اور سرفراز کرنے لگا

"خیال"

شرح دیوان غالب پر ایک نظر

اصل مضمون شروع کرنے سے پہلے علی سبیل الاعتذار اتنا عرض کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہی کہ اس تنقید سے میرا یہ منشا ہرگز نہیں ہی کہ کسی سے معارضہ کیا جائے۔ میرے کلام کے سننے اور پڑھنے والے اور میرے جاننے والے جانتے ہیں کہ میں مرزا غالب مرحوم کو اپنا ہادی و دلیل سمجھتا ہوں اور انکی پیروی کرنا اپنا فخر جانتا ہوں اسیطرح علامہ طباطبائی مدظلہ کو بھی میں اپنا بزرگ اور بمنزلہ استاد سمجھتا ہوں۔ بریں ہمہ جس طرح کتم شہادت ایک گناہ عظیم ہی اسی طرح میرے عقیدے میں خادم ادب ہونے کا دعویٰ کر کے کسی ادبی مسئلہ کے متعلق دیدہ و دانستہ کسی غلط فہمی کو ظاہر نہ کرنا بھی ایک ناقابل معافی گناہ ہی۔

کلام غالب کے متعلق آج کل عجب طوفان بے تمیزی برپا ہی۔ اگر ایک طرف سے آواز آتی ہی کہ فرمودۂ غالب سراسر الہام و وحی ہی تو دوسری جانب سے غالب کے بہترین اشعار کی نسبت بھی مہمل و بے معنے ہونے کی صدا سنائی دیتی ہی۔ یقیناً ہر صاحب ذوق سلیم ان دونوں نفیروں کو بانگ بے ہنگام سمجھتا ہی۔ غالب کے بہترین کلام کو بہترین ماننے میں کلام کرنا میرے نزدیک مذہب شاعری میں کفر ہی لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مرزا کے دیوان میں بعض اشعار ایسے بھی ہیں جو اُن کی ابتدائی عمر کی دقت پسندی کی وجہ سے محل اعتراض قرار پاتے ہیں۔ ہر چند غالب کے شارحین نے طرح طرح سے ان اشعار کا مطلب سمجھانے کی کوشش کی ہی لیکن جیسی چاہئے کامیابی نہیں ہوئی۔

اس وقت تک جتنی شرحیں میری نظر سے گزری ہیں اُن میں علامہ طباطبائی سے بہتر کسی کی شرح نہیں ہی۔ علاوہ اُن افادات علمیہ و ادبیہ کے جو خاص مولانا کا حصہ ہیں تفہیم مطالب میں بھی

جو پایہ اس شرح کا ہے دوسری کا نہیں ہو سکتا۔ بریں ہمہ مجھے بعض بعض اشعار کے متعلق مولانا کی رائے سے اختلاف ہے اور میں طبعاً مجبور ہوں کہ جو میرا خیال ہے اس کو محض ادبی خدمت کی حیثیت سے معرض اظہار میں لاؤں۔ اگرچہ میں جانتا ہوں کہ اپنے اس ارادے کو قوۃ سے فعل میں لانے کی وجہ سے میں مولانا مدظلہ اور مرزائے مرحوم دونوں کے ہواخواہوں کو اپنا مخالف بنا لونگا لیکن فریق ثالث کے لئے میری یہ سعی (مشکور یا نامشکور) صحیح فیصلے کے لئے کوئی راہ ضرور نکال دے گی۔

وَمَا عَلَیْنَا اِلَّا الْبَلَاغ

ضامن کنتوری

النظر

(۱)

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

"کاغذی پیراہن" شارح علامہ تسلیم کرتے ہیں کہ کاغذی پیراہن فریادی سے کنایہ فارسی میں بھی ہے اور اردو میں بھی میر ممنون اور مومن خاں کے کلام میں پایا جاتا ہے۔ اب مصنف نے جو کسی خط میں لکھا ہے کہ ایران میں رسم ہے کہ داد خواہ کاغذ کے کپڑے پہن کر حاکم کے سامنے جاتا ہے الخ اسکی اصلیت کے لئے مولانا تاریخی ثبوت کے تلاش میں جا پڑے لیکن یہ مورخ کا کام ہے ہمارا فرض نہیں ہے فارسی میں اس محاورے کے استعمال کی دو نظیریں مجھے بھی یاد ہیں اور وہ یہ ہیں:-

"از دست محرفاں بہ فریاد — پیراہن کاغذی پئے داد
(ابوالحسن فرید آبادی شارح خاقانی)

"ایں نامہ نیست پیرہن کاغذی ماست — پرخوں ز دست ہجر بہ جاناں کہ میبرد
(امیر خسروؒ)

اب شعر کے مطلب پر آئیے۔ مولانا تحریر فرماتے ہیں کہ "اس شعر میں جب تک کوئی ایسا لفظ نہ ہو جس سے فنا فی اللہ ہونے کا شوق اور ہستی اعتباری سے نفرت ظاہر ہو اسے با معنی نہیں کہہ سکتے"۔ ہے یہ کہ ان۔ حالی کی جانب مصنف کی تحریر نے شارح کا خیال رجوع کیا ہی جو یہ ہے "بس شاعر خیال کرتا ہی کہ نقش کس کی شوخی تحریر کا فریادی ہی کہ جو صورت تصویر ہی اس کا پیرہن کاغذی ہی؛ یعنی ہستی اگرچہ مثل ہستی تصویر تصاویر اعتبار محض ہو موجب رنج و ملال و آزار ہی"۔ بہ قول شارح اس تحریر سے مرزا کی غرض یہ پائی جاتی ہی کہ "نقش تصویر فریادی ہی ہستی بے اعتبار و بے توقیر کا اور یہی سبب ہی کاغذی پیراہن ہونے کا"۔ اعتراض یہ ہی کہ "ہستی کے بدلے جو عدم گنجائش کی وجہ سے شعر میں نہ آسکتا تھا شوخی تحریر کہا گیا اور اس سے کوئی قرینہ ہستی کے حذف پر پیدا نہیں ہوا اور شعر المعنی فی البطن الشاعر کا مصداق ہو کر رہ گیا"۔

میں یہ کہونگا کہ نقش اور ہستی کو جدا جدا کیوں فرض کیجئے جس سے یہ معنی پیدا ہوں کہ "نقش فریادی ہی ہستی بے اعتبار و بے توقیر کا"۔ کیونکہ نقش جب منصۂ ظہور میں آچکا تو وہ خود ایک ہستی ہی اور جب مراد مصنف یا بقول مصنف ہستی بے اعتبار ہی اسلئے کہ ہر ہستی ممکن بے اعتبار ہی؛ یا بہ الفاظ دیگر یوں کہئے کہ منصۂ ظہور یا معرض تحریر میں آتے ہی یہ ہستی یا نقش اپنے عبد سے جدا ہو گیا اور جدا ہونے کے ساتھ ہی بے اعتبار بھی ہو گیا اور اسی فاقد اعتبار جدائی نے اسکو مائل بہ فریاد کیا اور فریادی ہونے کا ثبوت یہ ہی کہ اسکا پیرہن کاغذی ہی۔

غالب قیاس یہ ہی کہ مرزا غالب نے اس خیال کو مثنوی مولانا روم کے مطلع اور شعر مابعد سے لیا ہے جو یہ ہیں:—

"بشنو از نے چوں حکایت میکند | وز جدائی ہا شکایت میکند"

"کز نیستاں تا مرا ببریدہ اند | از نفیرم مرد و زن نالیدہ اند"

پیرایہ بیان بدیع اور نقش، تصویر، پیکر، کاغذ، پیراہن وغیرہ متناسب الفاظ ہیں جنکا اجتماع خالی از لطف نہیں ہی۔

(۲)

جراحت تحفہ الماس ارمغاں داغ جگر ہدیہ
مبارک باد اسد غمخوار جاناں دردمند آیا

شارح علامہ 'غمخوار' سے پہلے عشق مراد لیکر پھر فرماتے ہیں کہ "یہ بھی احتمال ہے کہ غمخوار سے ناصح مراد ہے اور مبارک باد تشنیع کی راہ سے ہے"۔ میں کہتا ہوں کہ ناصح آئے گا تو جراحت اور داغ جگر کا تحفہ نہیں لائے گا' ہاں جراحت اور داغ جگر پر چھڑکنے کیلئے سودۂ الماس یا نمک لائے گا'۔ اس لئے شعر زیر بحث میں آنے والا یعنے (غمخوار جاناں دردمند) عشق ہی ہو سکتا ہے اگرچہ الفاظ میں اسکو ظاہر نہیں کیا گیا۔ دوسرے احتمال کی اس میں مطلق گنجائش نہیں ہے۔

(۳)

تھا خواب میں خیال کو تجھسے معاملہ
جب آنکھ کھل گئی نہ زیاں تھا نہ سود تھا

شارح مدظلہ فرماتے ہیں "مصنف نے گویا اس شعر کو یوں کہا ہے (زمانہ عیش نہ تھا بلکہ خواب میں الخ)" میں کہتا ہوں کہ یہ تاویل بعیدہ ہے کہ مصنف نے خواب سے زمانہ عیش گذشتہ مراد لیا ہو' علی الخصوص جب 'تجھسے' کی ضمیر مخاطب بھی اس خیال کی نفی کر رہی ہے۔ ہم کیوں نہ کہیں کہ قائل نے شب کو خواب دیکھا اور حالت خواب میں معشوق سے مصروف اختلاط رہا۔ لیکن "جب آنکھ کھل گئی الخ"۔ اور یہی روداد بروقت ملاقات وہ اپنے معشوق سے اس شعر میں بیان کر رہا ہے۔ یہ سامنے کا مضمون مبنی بر واقعہ ہے جس کے لئے کسی تاویل کی ضرورت نہیں

(۴)

لیتا ہوں مکتبِ غمِ دل میں سبق ہنوز
لیکن یہی کہ رفت گیا اور بود تھا

اس شعر کی شرح میں بھی شارح نے 'رفت' و 'بود' کا فاعل زمانۂ عیش کو فرض کرکے معانی کو دور ڈالا ہے۔ شاعر کا مقصود وہی تو محض 'دل' معلوم ہوتا ہے جو کبھی تھا اور پھر جاتا رہا۔ غمِ دل کے الفاظ یہی معنے دے رہے ہیں اور بس۔ ہاں کہنے کو کہہ سکتے ہیں کہ جب دل گیا تو اسکے ساتھ لطفِ زندگی بھی گیا گویا دل کی یاد عین عیش گزشتہ کی یاد ہے۔ مگر یہ معنی معنی زاید ہوں گے شعر میں معنی زاید کا ہونا اس کے حسن میں اضافہ کرتا ہے بشرطیکہ اصل عبارت معنی زاید کی محتاج نہ ہو۔ یہی صورت اس شعر میں ہے اور اسی کا نام بلاغت ہے

۵

ڈھانپا کفن نے داغ عیوب برہنگی
میں ورنہ ہر لباس میں ننگ وجود تھا

مولانا فرماتے ہیں :۔ "ننگ وجود ہونے کو برہنگی سے تعبیر کیا ہے" پھر یہ بھی فرماتے ہیں کہ :۔ "فقط لفظ کا تشابہ مصنف کے ذہن کو ادھر لے گیا" اور مزہ یہ ہے کہ شعر میں معنی بھی ایسے پنہاں ہیں جو الفاظ سے نہیں نکلتے ۔ مانا کہ مصنف کا منشا یہی ہے کہ :۔ "زندگی بھر میرے عیوب کا جو داغ کسی لباس میں نہ ڈھپ سکا تھا اس کو کفن نے ڈھانپا" لیکن برائے خدا یہ تو فرمائیے کہ برہنگی کے معنے ننگ وجود ہونے کے کیونکر ہوئے ۔ کیا ننگا ہونا اور ننگ وجود ہونا ہم معنی ہیں ؟ اگر یہ کہئے کہ قایل دیوانگی کی حالت میں ننگا پھرا کرتا تھا اس لئے اسکو ننگ وجود کہا ' تو پھر ہر لباس میں ننگ وجود ہونا یعنے چہ ؟ اور اگر یہ کہئے کہ انسان چونکہ ننگا پیدا ہوتا ہے اسلئے 'ننگ وجود ہے' اور 'زمین' سے مراد نوع قایل یعنے انسان ہے تو یہ فطرۃ الٰہی پر اعتراض ہوگا ۔ یا اگر مصنف کی مراد برہنگی سے تجرد روح اور لباس سے جسم ہے تو داغ عیوب کی اضافت روح کے ساتھ بے محل ہوگی بلکہ بے معنی ۔

اصل یہ ہے کہ برہنگی کا لفظ اس شعر میں صحیح محل نہیں رکھتا اس لئے اس نے پورے شعر کو لباس معنی سے عاری کر دیا ہے ۔ اسی مطلب کو غالب نے ایک جگہ اور بھی نظم کیا ہے ۔ فرماتے ہیں ؎

دیکھکر در پردہ گرم دامن افشانی مجھے | کر گئی وابستۂ تن میری عریانی مجھے

اسکی نسبت ہم برمحل اظہار رائے کریں گے ۔

۶

میں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل بارہا
میری آہ آتشیں سے بال عنقا جل گیا

اس شعر پر اعتراض یہ ہے کہ مصنف کا یہ کہنا کہ میں عدم سے بھی باہر ہوں اس کا حاصل یہ ہوتا ہے کہ میں نہ موجود ہوں نہ معدوم ہوں اور نقیضین مجھ سے مرتفع ہیں ۔ شاید ایسے ہی اشعار پر دلی میں لوگ

کہا کرتے تھے کہ غالب بے معنی شعر کہا کرتے ہیں" مولانا شاید یہ کہکر خود اعتراض کی ذمہ داری سے بری ہوگئے خیر ہو جانے دیجے۔ اب آپ اس شعر کے ماخذ کو ملاحظہ فرمائیے۔ مرزا بیدل فرماتے ہیں:۔

جز بہ گمنامی نشاں امن نتواں یافتن ورنہ از پرواز ماتا بال عنقا آتش است

ظاہر ہے کہ غالب نے اپنے شعر کا مضمون یہیں سے لیا ہے اور مرزا بیدل کے مقام گمنامی کو عدم سے بھی پرے ہونے سے تعبیر کیا ہے۔ اسی تصرف کی وجہ سے اعتراض وارد ہوا اور حق یہ ہے کہ اس اعتراض کا کوئی جواب نہیں ہو سکتا۔

شمع

اس قدر بیتاب کیوں ہے کیا بھری ہیں بجلیاں
یا کسی عاشق کی ساری تجھ میں ہیں بے چینیاں

رات بھر سوز الم میں کس کے تو جلتی رہی
موت پر پروانہ کی تو ہاتھ کیوں ملتی رہی

تیری ہستی سے ہی بیشک رونق بزم حسین
حسن انکا ماند تھا گر تو نہ ہوتی ہمنشیں

زندگی موہوم تیری صبح تک جسکی بہار
ڈھیر کچھ پروانوں کا ہے اور کچھ گرد و غبار

پھر کسی غنچہ دہن گلرو نے چٹکی لی اگر
بنکے شمع انجمن بس ہو گئی تو جلوہ گر

زندگی کا تجھ کو جلنے ہی میں ملتا ہے مزا
ہے سبق آموز دنیا کے لئے جینا ترا

مونس خلوت ہے تو ہی راحت عشاق ہے
لذت سوزش میں پروانہ بھی کیا طاق ہے

شمع و پروانہ کی الفت کا کوئی پوچھے جو راز
کچھ نہیں ہے بھید اسمیں ہے فقط ناز و نیاز

"بسمل"

کارِ مرداں

از جناب آزاد سہارنپوری

محبت کارِ مرداں خدا معلوم ہوتی ہے
یہ عزت، عزت ہر دو سرا معلوم ہوتی ہے

ابھی سے تنگ آ کر آرزو کے دمبدم شکوے
ابھی تو آرزو کی ابتدا معلوم ہوتی ہے

خدا حافظ دلِ بے صبر الفت کا خدا حافظ
مری الفت بہت صبر آزما معلوم ہوتی ہے

نظر تو کر کہ اسکی آن کیا عالم دکھاتی ہے
خبر تو ہو کہ اسکی شان کیا معلوم ہوتی ہے

مرے شوقِ سزا کا خوفناک آغاز تو دیکھو
کسی کا جرم ہو اپنی خطا معلوم ہوتی ہے

بس اب بیچارگی سے صلح کر لینی مناسب ہے
کہ اب بیچارگی اسکی رضا معلوم ہوتی ہے

مری گم گشتگی کیا دیکھتے ہو۔ بلکہ یہ دیکھو
مری گم گشتگی کس کا پتا معلوم ہوتی ہے

تمھاری بزم کو مامونِ دخلِ شرع پایا ہو
تمھارے سامنے نوشی روا معلوم ہوتی ہے

وہ میری زیست جس سے ہر مسرت کی توقع تھی
غمِ نا مختتم کا سلسلہ معلوم ہوتی ہے

کبھی ہستی عالم اصل پر مبنی سمجھتا ہوں
کبھی بالکل نمودِ سیمیا معلوم ہوتی ہے

ضرورت ہے کہ پھر کوئی بڑا انساں پیدا ہو
کہ پھر انسانیت بے دست و پا معلوم ہوتی ہے

بس آزاد اب وجودِ آن کا خاتمہ سمجھو
طبیعت دشمنِ ہر ماسوا معلوم ہوتی ہے

کاریگروں اور میکانکل انجنیروں کی ضرورت

کسی قوم کی دولت و خوشحالی زیادہ تر اس بات پر منحصر ہوتی ہے کہ اس قوم کے افراد کس قدر کام کرنے کے عادی ہیں۔ وہی پودا پھولتا اور پھلتا ہے جس کی جڑیں فراہمی غذا کی جد و جہد میں سخت سے سخت زمین میں راستہ نکال لیتی ہیں۔ اسی طرح وہی قوم سرسبز و شاداب ہو سکتی ہے جس کے افراد سخت سے سخت حالات کے تحت اپنی ترقی و بقاء کا راستہ پیدا کرتے ہیں۔ موجودہ زمانہ میں کسی قوم کی رفعت اور اسکی ترقی کا معیار اسکی صنعتی و تعمیری جد و جہد ہے۔

خدا کا شکر ہے کہ ہندوستان میں بھی اب بیداری کے آثار پیدا ہو چلے ہیں۔ ہندوستانی اپنی فلاح و بہبود کو پیش نظر رکھ کر بتدریج اپنے انفرادی مطالبات میں اضافے کرتے جا رہے ہیں۔ اس قسم کے انفرادی مطالبات کے پورا ہونے سے دنیائے انجنیرنگ کی ترقی کی وسعت بھی یقینی ہو جاتی ہے۔ اگر لوگ جہاں ہیں وہیں رہنا چاہیں تو انجنیرنگ بھی جہاں ہے وہیں رہیگی لیکن اس سے اس اہم ترین قانون قدرت کی تکذیب ہوتی ہے جو قانون ارتقاء کے نام سے موسوم ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ قانع ترین اور سادہ ترین انسانوں میں بھی زندگی کے اعلیٰ درجہ پر پہنچنے کا طبعی میلان و جذبہ پایا جاتا ہے۔

ہندوستان میں مدت سے سیول انجنیر پیدا ہو رہے ہیں جنہوں نے ہندوستان اور ممالک متمدنہ میں تعلیم پائی اور بالکلیہ ہندوستان ہی میں تجربہ حاصل کیا اور اپنی خدمات سے ماورِ ہند کو فائدہ پہنچایا اور پہنچا رہے ہیں۔ ان خدمات کی اہمیت اور وسعت اظہر من الشمس ہے اور اسلئے یہاں ان کی توضیح و تشریح کی ضرورت نہیں۔

لیکن میکانیکل انجنیروں کے بارے میں یہ بات صادق نہیں آتی ۔ ہندوستان میں انکا کال ہے خصوصاً حیدرآباد دکن میں میکانیکل انجنیرنگ درسگاہ کی عدم موجودگی خاص طور پر قابل التفات ہی ۔ کوئی حیدرآباد جیسی وسیع قلمرو ترقی کے اعلیٰ مدارج کو اس وقت تک طے نہیں کرسکتی جب تک کہ وہاں اس قسم کی سہولتیں با فراط موجود نہ ہوں جو ایک کثیر جماعت کے لئے میکانیکل اور سائنٹیفک تعلیم حاصل کرنے میں ممد و معاون ہوں ۔ اس زمانہ میں ہندوستان میں عموماً اور حیدرآباد میں خصوصاً میکانیکل انجنیرنگ کے مختلف شعبوں میں تعلیم یافتہ اشخاص کی معمولی کاریگروں سے لیکر ماہر فن انجنیروں تک کی سخت ضرورت ہی ۔

اس ضرورت کا شدید ترین احساس ان افراد کو ہوتا ہی جن کو آئے دن ماہر مزدوروں اور سوپروائزروں کے مہیا کرنے میں مشکلات سے دوچار ہونا پڑتا ہی ۔ نقشہ نویسوں کا ملنا تو امر محال ہے ۔

صنعت میں وسعت ۔ ہندوستان درحقیقت زرعی ملک ہی لیکن زراعت کو بھی کوئی خاص فروغ حاصل نہیں ۔ آجکل کی دنیا میں اچھی فصل کی پیداوار میں انجنیر اور علماء سائنس بہت اہم حصہ لیتے ہیں ۔ زراعت، سائنس اور انجنیرنگ جس قدر ایک دوسرے کے قریب آتے جائیں گے، اور جس قدر زیادہ ان میں میل ہوگا، اسی قدر زیادہ اضافہ پیداوار میں رونما ہوگا، اور بنی آدم کی خوشحالی میں یہی روز افزوں ترقی ہوگی ۔ یہ امر باعث طمانیت ہی کہ اب کسانوں کی آنکھیں کھلتی جارہی ہیں، اور وہ پرانے دقیانوسی آلات زراعت کو بتدریج ترک کرکے نئے آلات سے فائدہ اٹھارہے ہیں ۔ یہی نہیں بلکہ لفظ "خوبی کار" (Efficiency) کی اہمیت کی حقیقت بھی روز بروز کھلتی جارہی ہی ۔

آب پاشی، حفظان صحت، اور تدابیر رفع قحط کے بڑے بڑے مسئلوں میں بھی میکانیکل اور سیول انجنیرنگ کو بہت کچھ دخل ہی ۔ ہندوستان کی معدنی دولت سے اگر کافی فائدہ اٹھایا جائے تو صنعت کی بے انتہا وسیع شاخیں پھوٹ نکلتی ہیں ۔ مستقبل کی عظیم الشان امکانی ضرورتوں کو نظر انداز کرکے بھی صرف موجودہ حالات کا خیال رکھا جائے تو تعلیمی مرکزوں کا وجود از بس ضروری ہی اور میکانیکل انجنیروں کی ایک کثیر تعداد لازمی ۔

ہندوستان کے کارخانہ داروں کو سب سے اہم لاینحل سوال یہ درپیش ہی کہ کس طرح لوگوں کو اپنے ملکی

خریدنے کی ترغیب و تشویق دلائی جائے۔ اس کساد بازاری کے مختلف اسباب ہیں جن میں سے خاص خاص یہ ہیں:۔ قدامت پسندی، روپیہ کی قلت، اور عدم اعتمادی (ا) میکانیکل طریقوں میں اور (ب) ہندوستان میں مشنری سے بنی ہوئے چیزوں میں۔ ان اسباب کا رفع کرنا ناممکن نہیں۔ تعلیم کی توسیع واشاعت لوگوں کو اشیاء کی خوبیوں سے وسیع پیمانہ پر واقف کرنا، مشنری اور کارخانوں کو اچھے میکانیکل انجنیروں کی نگرانی میں رکھنا، کارخانہ داروں کا خلوص کے ساتھ کام کرنا، اور مصنوعات کو بہتر سے بہتر صورتوں میں ترقی دینا، یہ سب ایسی چیزیں ہیں جن سے اعتماد قائم کیا جاسکتا ہی۔ تجارت بسرعت فروغ پاسکتی ہی اور سرمایہ لگانے والوں اور کام کرنیوالوں کی ہمت بندھ جاتی ہی۔ اسکا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ صنعت کے مختلف شعبوں میں ترقی کی راہیں خودبخود بتدریج کھلتی جائیں گی اور اس طرح ملک کی دولت بڑھتی جائے گی۔ چھوٹے اور بڑے سرمایہ کی قلت رفتہ رفتہ دور ہوتی جائیگی۔ اور مسلسل کوشش ومحنت کا نتیجہ مالی و مادی طاقت میں یکساں مستقل ترقی کی صورت میں جلوہ گر ہوگا۔

ہندوستان میں تمام قسم کی اشیاء کی وسیع تر پیمانہ پر طلب پیدا کرنا بہت آسان ہی! کیونکہ موجودہ طلب کا دائرہ بالکل محدود و تنگ ہی۔ ہاتھ پیر ہلا کر دنیا میں کچھ کام کرنے اور جو کچھ ہی اس سے زیادہ حاصل کرنے کا احساس مفلس سے مفلس شخص کے دل میں بھی تڑپتا رہتا ہی۔ جس شخص کے دل میں اس قسم کے جذبات مُردہ ہوں اس کو ہم عجیب الخلقت کے نام سے ہی موسوم کرسکتے ہیں۔ وہ یا تو مافوق الانسان ہوگا یا تحت الانسان اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم قناعت کی خوبیوں سے انکار کررہے ہیں بلکہ ہمارا مقصد یہ دکھانا ہی کہ قناعت کے ساتھ ساتھ اگر کسی قسم کی علوہمتی اور بلند خیالی کا وجود نہ ہو تو اس قسم کی قناعت غیر فطری ہوگی۔ ظاہر ہی کہ کوئی قوم اپنے مفلسوں کے معیار زندگی کی حد قائم نہیں کرسکتی۔ امریکہ میں مفلسوں کا معیار زندگی ہندوستان کے متوسط طبقہ کے معیار زندگی سے بہت بڑھا ہوا ہی۔ بہرحال دوسرے ممالک متمدنہ کی طرح ہندوستان کے ارباب حل وعقد کو بھی اب یہ طے کرلینا چاہیئے کہ ہندوستان کی حقیقی فلاح وخوشحالی کا بہترین راستہ کونسا ہی کسی دوسری روش کے معنے تنزل وانتشار کے سوا اور کچھ نہیں۔

جب کسانوں کو یہ یقین دلادیا جائے کہ لوہے کے ہل لکڑی کے ہلوں سے بہت زیادہ مفید تر

نتائج پیدا کرتے ہیں تو اس قسم کے ہل کم از کم دس لاکھ کی تعداد میں بازاروں میں موجود ہونے چاہئیں اور
اگر ان کی قیمت بالفرض ۱۰ روپیہ سے ۶۰ روپیہ تک کی وسعت میں اہتزاز کرے اور اگر فی ہل اوسط قیمت
۲۰ روپیہ شمار ہو تو کل قیمت ۲ کروڑ روپیہ حاصل ہوگی۔ اگر سیکلوں کے کارخانے قائم کئے جائیں اور ہر چالیس
شخصوں میں سے ایک شخص سیکل خریدلے تو لین دین کی مقدار ایک ارب روپیہ ہوگی۔ اگر خدائے کارساز
کارسازی کی ہدایت دے اور اگر سو میں سے ایک شخص بھی ایک سستی موٹر کار کا مالک ہوجائے تو رقم خریداری
کسی طرح بارہ ارب سے کم نہیں ہوسکتی۔ (امریکہ میں فی الحال ہر آٹھ شخصوں میں سے ایک شخص کے پاس
موٹر ہے اور اس پر بھی حالت یہ ہے کہ کارسازی کی شرح اس سرعت سے بڑھ رہی ہے کہ حیرت ہوتی ہے)
...... ۲ ہولواروؤ کمروں والے مکانوں کی تعمیر میں بحساب ۵۰۰ روپیہ اور ۱۰۰۰ روپیہ فی مکان علی الترتیب
دس ارب اور بیس ارب روپیہ کا خرچ مضمر ہے۔ ان اعداد و شمار میں مکانوں کی نوعیت اور مکانیت کی
وسعت کے اضافے کے ساتھ ساتھ اضافہ ہوتا جائیگا۔ ہندوستان کے نصف مکانوں میں اگر ایک ایک
برقی پنکھا اور چند برقی گولے لگائے جائیں تو ان کے نصب کرنے میں ہی تقریباً ۵ ارب روپیہ کی رقم صرف
ہوگی۔ قوتِ برقی کا خرچ تو جدا گانہ ہے۔ اسی طرح کی بیشمار مثالیں دیجاسکتی ہیں۔ ان مثالوں سے ظاہر ہے
کہ صنعت کا میدان کس قدر وسیع اور عظیم الشان ہے۔ موجودہ ضرورتیں تو ان کے سوا ہیں۔

ترقی یافتہ ممالک میں (مثلاً امریکہ) ہر اوسط (معمولی) شخص کی طلب زیادہ ہوتی ہے وہ زیادہ کی
کوشش کرتا ہے اور عام طور پر زیادہ ہی حاصل کرتا ہے۔ ہندوستان میں برعکس اس کے ہر شخص کی طلب کم ہے کم کی
کوشش کرتا ہے اور کم ہی حاصل کرتا ہے۔ لیکن ارتقار کا عمل جس طرح امریکہ میں جاری ہے اسی طرح ہندوستان
میں بھی۔ ہندوستان کی خانہ داری کی زندگی کا جو عام معیار ہے اس کو یوروپی یا امریکی معیار تک پہنچانا یا اسکے
قریب پہنچانا فی الحال موجودہ سست رفتار ترقی کے پیش نظر جھونپڑیوں میں محلوں کے خواب دیکھنا ہے۔ اسکے لئے
سخت سے سخت محنت اور کاوش درکار ہے اور جب تک ہماری ذہنیت

جو کچھ ہے وہی بہت ہے
اس سے زیادہ کیا چاہیئے

پر عمل کریگی اس وقت تک ترقی کا امکان بعید از قیاس ہے۔ لیکن اس دنیا میں ترقی فطری اور ضروری ہے اور اسکے لئے ہمیں سرگرم ہو جانا چاہیئے۔ ہندوستان میں یہ بہت ممکن ہے کہ آئندہ بھی زراعت کو صنعت پر فوقیت حاصل رہے لیکن مادی فلاح و ترقی سائنٹفک اور صنعتی جد و جہد کے ذریعہ ازبس ضروری ہے۔ اس وسیع میدان میں قدم بڑھانے کے لئے سب سے پہلے ہر قسم کے پیشہ و حرفہ کے تعلیم یافتہ اشخاص کی رہنمائی کی ضرورت ہے۔ چنانچہ صنعت انجنیرنگ میں کاریگر، سوپر وئیزر، نقشہ نویس، منتظم اور ارگنایزر مطلوب ہیں۔

موجودہ طلب بمقابلہ اس کے بہت زیادہ ہے۔ اور ہندوستان کی حالت کو بہتر بنانے کے لئے فنی طلبا اور اعلیٰ درجہ کے کاریگر پیدا کرنا ہی کافی نہیں بلکہ ضرورت اور شدید ضرورت اس بات کی بھی ہے کہ عوام میں صنعت کا شوق عام کیا جائے اور لوگ خانگی مہمات کا بیڑا اٹھائیں۔

نظریہ اور عمل۔ دنیا کے تمام حصوں میں خالص نظری علم رکھنے والے انجنیروں کی مانگ بہت محدود ہے اس قسم کے انجنیر کالجوں سے فارغ التحصیل ہوکر نکلتے ہیں اور ملازمت کی تلاش میں سرگرداں ہو کر ناکام رہتے ہیں تو قسم قسم کی شکایتیں مختلف طریقوں سے پیش کیا کرتے ہیں۔ اس کے یہ معنے نہیں کہ تعلیم میں کوئی نقص ہے بلکہ صرف یہ کہ تعلیم کی تکمیل نہیں ہوئی۔ ان لوگوں کا مقصد اکثر و بیشتر ڈگری یا گریڈ حاصل کرنا ہوتا ہے حالانکہ ضرورت اسکی ہے کہ اپنی اپنی شخصیت قائم کیجائے، اختراعی استعداد کی نشو و نما ہو، کاروباری قابلیتوں کو ترقی دیجائے اور قوائے ترقی میں اسراع پیدا کیا جائے۔ یہ کہنا کوئی مبالغہ نہیں کہ انجنیرنگ میں استعداد کو کم از کم اتنی ہی اہمیت حاصل ہے جتنی نظری قابلیت کو حاصل ہے۔ کامیاب انجنیر کا دونوں میں مہارت تامہ و تجربہ حاصل کرنا ضروری ہے۔ کوئی منصف مزاج شخص کسی جامعہ کی ڈگری کی اہمیت گھٹانے کی جراءت نہیں کر سکتا کہ اس سے تحصیل علم کا معیار تعبیر ہوتا ہے لیکن اصلی کاروبار میں صرف اس قسم کی ڈگری سے ہی کام نہیں چل سکتا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ عملی قابلیتوں کا وجود بھی لازمی ہے۔

انجنیرنگ کالجوں اور درسگاہوں میں اکثر و بیشتر نظری تعلیم پر ہی زیادہ زور دیا جاتا ہے اور اسی پر خاص توجہ کیجاتی ہے۔ وقت کا صرف تھوڑا سا حصہ نقشہ کشی اور دار التجربہ میں صرف ہوتا ہے اور جو طالب علم کہ تجارتی کارخانہ میں عملی کام سیکھتے ہیں ان کی تعلیم و ترقی میں کافی دلچسپی نہیں لیجاتی۔ چند ہی ایسی درسگاہیں ہیں

جن سے چھوٹے چھوٹے کارخانے ملحق ہیں۔ لیکن ان کارخانوں کو تجارتی اصول پر چلانے کی کوشش نہیں کیجاتی اور نہ ان کو بڑے پیمانہ پر ترقی دینے کا رجحان پایا جاتا ہی۔ اگر کسی ہندوستانی طالب علم کو انگلستان میں ہر طرح سے مکمل تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملے تو اس سے بڑھکر اور کیا خوش قسمتی ہو سکتی ہی لیکن نوجوان طلباء کی ایک کثیر تعداد اس طرح کی تعلیم سے مستفید نہیں ہو سکتی۔

نظریہ اور عمل کے اتصال کی اہمیت پر زیادہ زور بھی نہیں دیا جا سکتا۔ ہم آئے دن یہ سنتے ہیں کہ ایک چیز تو نظری حیثیت سے ہر طرح مکمل ہو لیکن عملی حیثیت سے کسی کام کی نہیں۔ لیکن جب اسکی وجہ کی چھان بین کیجاتی ہے تو اکثر یہ بات منکشف ہو جاتی ہو کہ نظری حیثیت سے بھی وہ چیز مکمل نہیں کیونکہ عام طور پر نظری علم رکھنے والے اپنے مفروضات کی بنیاد خیالی شرطوں پر قائم کرتے ہیں جو بہت ممکن ہو کہ حقیقی طور پر موجود نہ ہوں علماء نظریہ چھوٹی چھوٹی باتوں کو اکثر نظر انداز کر دیتے ہیں جو عملاً بہت اہم ہوتی ہیں۔ اسی طرح عملی کام کرنے والے بھی نظری باتوں میں لغزشیں کر کے نقصان اٹھاتے ہیں۔ بلاشبہ جس نے نظری اور عملی تعلیم دونوں کی تکمیل کی ہو وہی کامیاب انجنیر بن سکتا ہی۔ اسکی پوری اہمیت روز بہ روز اس شخص پر کھلتی جاتی ہے جو کسی صنعت یا حرفہ میں ترقی کے منازل طے کر رہا ہی۔ تجارتی کارخانوں میں میکانیکل انجنیروں اور ماہر فن کاریگروں سے مشورہ کر کے ایک طریق عمل اختیار کیا جاتا ہی اور اگر خدانخواستہ کسی چوک یا غلطی سے کوئی بات رہ گئی تو اس غلطی کا نتیجہ کثیر نقصان کی صورت میں رونما ہوتا ہی۔ لیکن یہ یاد رہے کہ یہ کثیر نقصان خالی از فائدہ بھی نہیں۔ اس سے ایسا سبق ملتا ہو کہ دوبارہ اس قسم کی غلطی ممکن نہیں۔ ہر کارخانہ میں نمونوں اور نقشوں میں انتہائی صحت کا خیال رکھنا از حد ضروری ہے۔ اس راز سے نوجوان طالب علم ابتدأ بہت کم آگاہ ہوتا ہی۔

اگر درسگاہ یا کالج اور کارخانے جدا جدا مقامات پر قائم ہوں تو طالب علم کو مشکل سے اپنے نظریوں کی تطبیق کا موقع ملتا ہی جس کی انجنیرنگ میں اس قدر ضرورت ہی۔ معمولی ڈبریوں سے لیکر برقالوں (Electric generators) تک مختلف اشیاء کے نمونوں کے نقشے کھینچنا اور بات ہے اور ان کو عملی طور پر ڈھالنا اور بات۔ جب تک نقشے یا نمونے حقیقی صورت میں نہ بنائے جائیں اسکی

کوئی قدر و قیمت نہیں۔ عام طور پر طالب علم اس سے بھی ناواقف ہوتا ہے کہ آیا اس کے نقشے یا نمونے کارآمد بھی ہو سکتے ہیں یا نہیں کیونکہ اس کو اس کی جانچ کا موقع ہی نصیب نہیں ہوتا۔ بخلاف اس کے اگر اس کو یہ معلوم ہو کہ جس چیز کا وہ نمونہ یا نقشہ کھینچ رہا ہے اسکو عملی طور پر بنایا بھی جائے گا تو نقشوں کا برا یا بھلا ہونا فوراً ظاہر ہو جائے گا۔ دار التجربہ میں اس کا امکان ہے کہ کسی چیز کے غلط تجزیہ پر نظر نہ پڑے لیکن جب اس کو سانچہ میں امتحان کی خاطر ڈالا جائے گا تو غلطی ظاہر ہو جائیگی اگرچہ یہ غلطی بعد از خرابی بسیار و نقصان زر بے شمار کے مصداق ہو۔ اس قسم کی مثالیں بکثرت ملسکتی ہیں جہاں کافی خسارہ اٹھانے کے بعد غلطی کا اظہار ہوا۔ اس طرح اس معرکۃ الآرا مسئلہ میں اب کسی قسم کا شبہ نہیں معلوم ہوتا کہ تعلیم انجنیرنگ کی بہترین صورت یہ ہے کہ طالب علم نظری و عملی تعلیم ساتھ ساتھ جاری رکھے اور اسکو کافی سوچ بچار کا موقع دیا جائے اور پھر موجودہ فائدہ رسان تجارتی طریقوں سے اپنا کام جاری کرے۔ کاریگر کی دوربین نظر ہی ان تمام بے شمار چھوٹی بڑی چیزوں سے آشنا رہتی ہے جن کو نقشہ نویس، ڈرافسٹمن، تخمینہ نگار اور دوسرے کارکن نظر انداز کر دیتے ہیں۔

ایک اور بات قابل ذکر ہے اور وہ یہ کہ بہتیرے کالجوں میں کاروبار کے خالص تجارتی پہلو پر اہمیت نہیں دیجاتی سوائے ان خاص خاص جماعتوں کے جو اس مقصد کیلئے جاری کی گئی ہیں فقط

(ترجمہ) محمد نذیر الدین

ننّا سا مریض

ایک جاپانی اسپتال میں

ا

...... جھٹپٹے کے وقت ایک آخری مریض لایا گیا ۔ یہ کوئی تین چار سالہ لڑکا ہے، جسے نرسوں اور سرجنوں نے میٹھی میٹھی باتیں بنا کر نہایت خندہ پیشانی سے ہاتھوں ہاتھ لیا ۔ لڑکا اس خیر مقدم پر خاموش ہے ۔ ....

یہ ڈرا ڈرا اور روٹھا ہوا ہے؛ روٹھنے کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اسے آج کی رات اسپتال کیوں لایا گیا کیونکہ چند نادانوں نے اسے یقین دلا دیا تھا کہ تھیٹر چل رہے ہیں۔ جس سے سارے راستہ یہ باغ باغ رہا ۔ یہاں تک کہ اپنے ہاتھ کا دکھ بھول گیا ۔ مگر اسپتال تو تھیٹر نہیں ! یہاں قدم قدم پر ڈاکٹر ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر جو لوگوں کو دکھ دیتے ہیں ۔ ....

بیچارے نے کپڑے اتروا کر چپ چاپ معائنہ بھی کرا دیا ۔ مگر جب یہ کہا گیا کہ بجلی سے جگمگاتی ایک نیچی سی میز پر بھی لیٹ جاؤ تو اس نے نہایت پر زور لہجہ میں "ایا[1]" کہدیا ۔ ......

بزرگوں سے یہ بات اُسے ورثہ میں ملی تھی اور اُس پر اُسے یقین تھا کہ ایک کھلے دشمن کے آگے لیٹنا درست نہیں ! اور اسی غیبی بصیرت کی بناء پر سرجن کی مسکراہٹ اُسے کھلا دھوکہ معلوم دیتی تھی ۔

---

[1] "نہیں" ۔

ایک نوجوان نرس نے بہلاتے ہوئے یوں گلفشانی کی:۔
"اے اس میز پر لیٹنے سے بڑا آرام آتا ہے!.......... میاں، تمنے آہا کالا لال لال چادر ابھی دیکھا!........"

اس جاپانی چھیڑ سے ننھے منے آدمی کے پتنگے لگ گئے۔ چنانچہ پھر اس نے "ایا!" دہرلوی یہاں دو سرجنوں اور دو نرسوں نے ہاتھ بڑھا کر اُسے نہایت صفائی سے اٹھالیا اور لال چادر سمیت میز پر جا لٹا یا۔ جہاں ننھا منا اعلانِ جنگ کر کے اِس نے اپنی نسلی جنگ آزمائی کی داد چاہی اور کہنے کو بانہہ ٹوٹی ہوئی تھی مگر اس پر بھی دوسرے حکم تک خوب دادِ شجاعت دی۔

لیکن ذرا دیکھئے گا! ایک گیلا سفید کپڑا منہ اور آنکھوں پر رکھتے ہی گڑبڑ ختم ہوگئی ــــ نتھنوں میں ایک عجیب بھینی بھینی خوشبو پہنچی، ساتھ ہی آواز اور چراغ دور دور نظر آنے لگے، حتیٰ کہ ایک اندھیرے سمندر میں بچارا دمبدم ڈوبنے لگا.......

ننھے منے ہاتھ پیر شل ہو کر بے دمے ہوگئے۔ پھیپھڑے موت کی سی سُن کرنیوالی بے خبری سے آخری مرتبہ لڑکر تھکے۔ جس سے دم کے دم کچھ سانس سا پھولا۔ مگر اس کے بعد ساری بے چینی ختم تھی۔.......
کپڑا اٹھایا تو پھر وہی پیارا پیارا مکھڑا نظر آیا، جس پر غم و غصہ کی بجائے موت کی دیوی کی سی مسکراہٹ تھی۔.......

ٹوٹی ہوئی ہڈی کے صفائی کے ساتھ فوراً جوڑ ملا دئے گئے۔ بندھن، روئی، پیرس کا پلاسٹر اور پھر اوپر سے اور بندھن غرض مشاق ہاتھوں نے جلدی جلدی سارے مرحلے طے کر دئے۔ اسپنج سے منہ اور ننھے ننھے ہاتھ دھلائے۔ اور پھر ننھے سے بے ہوش مریض کو بلانکٹ اڑھا کر میز سے ہٹا لیا....
لانے سے لیجانے تک کی یہ ساری باتیں صرف ساڑھے بارہ منٹ میں پوری ہوگئیں۔

ہر وہ چیز جو پہلے پہل دیکھی جائے معمولی نہیں ہوتی۔ اس واقعہ کی ایسی تفصیلات جو سچ مچ دلکھیاری نہ تھیں ــــ مثلاً آواز کا تھک جانا، ارادہ کا سن ہو جانا اور ساتھ ہی سندر مکھڑے کی سکوت آمیز بدرنگی ــــ تو انہوں نے اس المناک واقعہ کو ایسے رنگ میں رنگ دیا کہ تخیل بھی

تاریک راہ پر کرپٹے ٹوئیاں مارنے لگا .... یوں کبھی مار بھی بعینہ یہی سکون اور ہنس مکھ آرام کے نتائج پیدا کر دیتی۔ چنانچہ اگلے زمانے میں بیسیوں دفعہ ایسا ہوا ہے۔ اور بیسیوں مرتبہ غصہ کی ایک ضرب سے کسی کے پیارے پن پر موت کی زردی گھمنڈ گھمنڈ گئی ہے ....

"پھر یہ نیندڑیاں اسوقت تک جاگیں اور نہ جگائی جائیں گی جب تک کہ یہ زمین و آسمان ہیں"۔ ہاں تو، "جب تک کہ یہ زمین و آسمان ہیں" مگر اس کے بعد! اس کے بعد شاید جاگیں تو جاگیں لیکن اس وقت بھی پہلے کی طرح نہیں ....

میں نے دیکھا آپے (Self) کے یوں یکایک لاچار ہو جانے پر مجھے تاثر سے زیادہ تعجب ہوا۔ کیونکہ اس طرح ایک راز فاش ہو گیا۔ یعنی یہی کہ پلک جھپکاتے ایک کیمیائی للکے نے آواز، حرکت، فکر، ارادہ ساری لذت و الم اور یاد غرض سب کو بیٹ دیا۔ احساسات کی کلیوں کی ساری بہار چھن گئی۔ ننھے منے دماغ کی نازک مشین پر جو نہ جانے کتنے بڑے بوڑھوں کے ورثہ سے مالامال ہوتی چلی آ رہی تھی موت کی خاموشی چھا گئی۔ اور اب وہاں دیکھئے تو جسد خاکی کا تودہ لایعنی ——— گوشت پوست کی ایک گڑیا پڑی رہ گئی جس کے لبوں پر مورتی کی سی ہلکی ہلکی بانجان مسکراہٹ تھی ....

گوتم بدھ کی پتھریلی اور ننھی منی مورتیوں کے مکھڑے جو سڑک کے آزو باز و یا مزاروں پر مست خواب دکھائی دیتے ہیں، جاپان کے بالکٹ بھولپن کے نمونے اور۔ وہاں کے ننداسے مکھڑوں سے ملتے جلتے ہوتے ہیں۔ ان کی بالی آنکھ ناک کا موہن پن اور رہونٹ اور پلکوں کی لکیروں میں پیار کی تحریر سمجھنے کے لئے ضرور ہے کہ آپ نے جاپان کے نندا سے بالکٹ دیکھے ہوں۔ کیونکہ بدھ سنگ تراشوں کے ہاں یہ بات فن میں داخل ہے کہ وہ الٰہی شانتی کو ایسی موہوم مسکراہٹ سے ہی اجاگر کرتے ہیں، جو اس بھولی ولاور وں کی نندیا سندر بنا دیتی ہے۔

۲

ان مورتیوں کی یاد سے فطرۃً مجھے وہ قومیں یاد آگئیں، جن کی یہ صرف نشانیاں ہیں اور ساتھ ہی

مجھے خیال ہوا کہ ایک خدا کے تصور میں انسان کی زندگی کا سارا زمانہ بالکل اس واقعہ کا سا ہی ہوگا جسے میں نے ابھی ابھی دیکھا ہی ——— یعنی آنا، رونا، ہاتھ پیر مارنا اور پھر اچانک موت کی اٹل بے خبری میں آپ پے کو میٹ دینا! (یہاں خدا سے میرا مطلب وہ خدائے عالمین نہیں جس کے آگے سورج کا روشن ہونا اور گل ہو جانا ایسا ہی جیسے ہم نے رات میں جگنو کی جھلک دیکھ لی۔ بلکہ میرا مقصود ایک ارضی خدا سے ہی) بقول ہربرٹ اسپنسر جب مچھر کا ننھا منا شعور ایک سکنڈ کے دس اور پندرہ ہزارویں حصے کی درمیانی کیفیت معلوم کرلیتا ہی، تو پھر ایک ایسی ہستی کے نزدیک جو روحانی لحاظ سے انسان سے اتنی ہی اعلیٰ و افضل ہو جتنا انسان مچھر سے ہی، تو کیا ایک اپشت کا زمانہ ایک لمحہ کے برابر نہ دکھائی دیگا؟ کیا ایسی ہستی کے آگے انسان کا وجود و عدم کلی کا کھلنا اور مرجھانا نہیں؟ ——— یعنی بننے اور بگڑنے کا ایک لامتناہی اور ناگزیر سلسلہ یا مادہ کے خمیر کی ایک عجوبہ کاری جو ایک ٹھنڈے ستارے کی سطح سے مخصوص ہی؟ واقع میں اگر یہ ہستی بھی اس مظہرِ قدرت کا یوں تفصیل وار مطالعہ کیا کرتی جس طرح ہم مادہ کے خمیر کا مطالعہ دوربینوں سے کرتے ہیں۔ تو اُسے ایک معصوم کی ہنسی فوراً ایک کھوپری والے قہقہہ میں مبدل ہوتی نظر آتی اور بصورت ثانی تو میں خیال کرتا ہوں، ایک پھول سے بالک کی پہلی مسکراہٹ سے لیکر اسکی کھوپری کے آخری مرتبہ مایوسانہ دانت نکوس دینے تک کے درمیان جو کچھ نفسیاتی طور سے پیش آتا ہی، وہ سارا کا سارا اس ہستی کے آگے ایسا ہی موہوم رہجاتا ہوگا جیسا ایک سکنڈ میں مچھر کے دس پندرہ ہزار مرتبہ پر مارنے کو ہم موہوم سمجھتے ہیں۔ مجھے اس بات میں شبہ ہی آیا ایک پورے نظام یا ایک ہی دنیا کے خدا کو ہمارے جذبات سے اس سے زیادہ لگاؤ ہی۔ جتنا سڑے ہوئے پانی کی ایک ننھی منی بوندیں کی سنسنی خیز زندگانی سے ہمیں ہوتا ہی......

لیکن پھر سوال یہ ہی، آخر انسان ہی کیا شئے؟ جو ایک خدا کی نظروں میں صرف اسواسطے مٹی سے ابھرتا معلوم دیتا ہی کہ پھر مٹ جائے اور یوں مٹ جانے سے پہلے دم کے دم اپنے ہنسنے رونے کا تماشہ بھی دکھا دے؟......... ایک جسد خاکی! جو برسا برس ہوئے، بے شکل و صورت مادہ کے نقطۂ تخلیق سے صبح ازل کی روشنی میں پیدا ہوا! مگر ارتقاء کی یہ تعلیم کسی طرح بھی اصل زندگی کی پہیلی نہیں بوجھتی ——— زندگی کی

ایسی پہیلی جو احساسات کا گورکھ دھندا ہی۔ اور جو برسا برس سے موت کا مقابلہ کر رہی ہی۔ بلکہ یہ کہئیے کہ موت کے ہرانے کی ٹوہ میں رُوح و مادہ کی عجیب و غریب گھتیاں ڈال رہی ہی۔ اور جس نے بالآخر اس طرح اپنے وجود کی ابتدائی عمر کو سو سال تک بڑھا ہی لیا!

انسان کی یہ احساسی صلاحیت بجائے خود ہزار پہیلیوں کی ایک پہیلی بن گئی ہی۔ خیال کے متعلق بھی اب یہ بات ثابت ہو گئی ہی کہ یہ احساس کا مجموعہ ہوتا ہی۔ لیکن خود ایک معمولی سی معمولی حس بھی مجموعہ یا کسی ترکیب کا نتیجہ ہوا کرتی ہی ـــــ جسے غالباً امتزاج کا تصادم یا اتحاد کی چپک کہا جاسکتا ہی۔ اور اس طرح پھر زندگی کی پہیلی ڈراؤنی اور ایسی مبہم رہ جاتی ہی کہ جس کی بوجھ ہی نہیں۔

اِسی رازِ حیات سے ڈر کر ہمارے باپ دادا نے بالآخر یہ یاس بھرا حکم لگایا اور گویا ہماری جان بچائی تھی کہ:ـــ

"بیٹا! سر دیجیو، آگ میں جل بھن کر بھسم ہو جائیو، مگر اللہ، سو جھیو نہیں!"

مگر پچھم کے ایک بڑے بوڑھے کی منادی بھی سُن لیجئے:ـــ

"اے تو کہ دنیائے پستی کے فرزند! اسبات کے بچار سے مت گھبرا کہ تو کہاں سے یوں اُبھر آیا! اس آتما کے بچار سے جس سے تو پیدا ہوا اور جس میں پھر ایک دن مل جانا ہی، تجھے اپنی ہستی قدیم، واحد اور غیر محدود نظر آئے گی!"........

سیّد وزیر حسن

اعتذار رسالہ کی اشاعت میں اس مرتبہ تعویق اسوجہ سے ہوئی کہ اسکی طباعت کے مسئلہ کو نواب حیدر نواز جنگ بہادر نے اپنے ہاتھ میں لیکر بغرض منظوری مجلس انتظامی جامعہ عثمانیہ میں پیش فرما دیا تھا۔ اب اولڈبوائے دارالطبع جامعہ عثمانیہ میں طبع ہو کر مدیر کے مکان سے حسبِ دستور شائع ہوا کریگا۔ خدا سے اُمید ہی کہ آئندہ رسالہ کے ہر شعبہ میں ناظرین کو ترقی نظر آئے گی۔

ایڈیٹر

یادِ ایام

قدردان دیور

بھائی پنجتن نے اولڈ بوائے میں چند سطریں لکھکر ایام گذشتہ کی یاد تازہ کی ہے خصوصاً پوسٹ مین کے نعلدار جوتوں کی آہٹ پر کانوں کے لگے رہنے نے آپ کو بھی کافی محظوظ کیا ہوگا۔" اللہ کرے زور قلم اور زیادہ" اسی طرح فیرینی اور کھچڑی کا ذکر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اب وہ دن کہاں رہے۔ اب تو یہ حال ہے کہ خود بھائی پنجتن کے کان پوسٹ مین کے نعلدار جوتوں کے بجائے شاندار موکلوں کے بے نعل بوٹ یا مفلس موکلوں کے ننگے پیروں کی آہٹ پر لگے رہتے ہوں گے (بھائی اصغر بھائی عسکری وغیرہ ہم بھی بُرا نہ مانیں) اُن پر کیا موقوف ہے ہم سب کے نہ وہ کان ہیں اور نہ وہ کانوں کا مرکز باقی ہے۔ "آں قدح بشکست و آں ساقی نہ ماند" نہ وہ دل ہے نہ وہ جوش و خروش ہے۔ نہ وہ ذوق ہے نہ وہ شوق ہے کہ زردہ اور فیرینی والا جمعہ کا دن آیا کہ وقت سے پہلے تیار ہو کر ڈائننگ ہال کے دروازے کو کھٹکھٹانے جا پہونچے' یا پلاؤ والا پیر اور بدھ کا دن آیا کہ مانیٹروں سے عہد و پیمان ہونے لگے' یا آموں کا موسم آیا کہ بقول پنجابی بھائیوں کے میٹھی کڑھی (گڑانبہ) کے شوق میں بھوک تیز ہونے لگی۔ وہ ہمت اور جرأت کہاں کہ صحت اچھی خاصی ہے مگر بیمار بننے کا شوق ہے طرح طرح کی اسکیمیں بیمار بننے کے لئے زیر غور ہیں کہ کسی طرح مصنوعی بیماری حاصل ہو جائے۔ ڈاکٹر صاحب صداقت نامہ عنایت فرمادیں اور ہم لوگ پرہیزی کھانے کا لطف اٹھائیں وہ اتحاد کہاں کہ جس وقت مرج آئی متفق ہوکر فوج کی فوج نے آم کے باغ کی طرف چڑھائی کر دی اور چشم زدن میں میدان صفاچٹ ہو گیا۔ وہ جگر او رکلیجہ کہاں کہ کسی والی ملک یا رئیس کے لئے گارڈن پارٹی دیجائے اور ہم پہنچکر ڈٹجائیں پیٹ بھر جائے تو جیبوں کو کام میں لائیں اور دن ڈہارے بلا کسی خوف وخطر کے ڈاکہ زنی

مرتکب ہوجائیں۔ بھائی منظر۔ اب وہ آزادی اور خود مختاری کہاں نصیب۔ جب تو یہ عالم تھا کہ جو جی چاہا کیا۔ ارتکاب جرم کے بعد بھی آزادی قائم تھی لیکن اب تو اگر ایسا کیا جائے تو اسکے سوا کوئی چارہ نہو کہ سرکاری مہمان بننا اور مشقت کی زندگی بسر کرنا پڑے۔ پبلک پارٹیز کا تو کیا ذکر پرائیویٹ پارٹیز میں بھی اب وہ شان نظر نہیں آتی ہاں ستثنیات ہر ایک قاعدہ کلیہ کے ساتھ ہوتے ہیں۔ ملک خدا تنگ نیست بھی آپنے سنا ہوگا۔ اِکّا دکّا کہیں اب بھی ایسے مردمیدان موجود ہیں جو اچھے شعر کی طرح اچھے کھانے پر بھی تڑپ جاتے ہیں وہ کیوں جاتے ہیں آپ ہی کے اڑوس پڑوس میں دو چھوٹے بڑے بھائی کالج کے اولڈ بائز موجود ہیں جن میں سے اول الذکر چھوٹے بھائی سب انسپکٹر آبکاری اور ثانی الذکر بڑے بھائی فوجی عہدہ پر فائز ہیں آ (گلاب جامن۔ لاحول ولاقوۃ) چھوٹے بھائی صاحب کا رنگ یہ ہے کہ اگر نہ ملے تو غم نہیں اور اگر ملجائے تو اچھے کھانوں کے ساتھ بہترین سلوک اور انصاف کرتے اور کھلانے والے کے ساتھ اعلیٰ ترین خلوص اور محبت رکھتے ہیں۔ میرا عینی مشاہدہ ہے کہ بڑے بھائی کے یہاں دعوت ہوئی بھابی جان نے انتہائی شفقت کام میں لاکر دیور کے لئے چٹپٹے سیخ کی کباب تیار کئے۔ دسترخوان بچھنا تھا اور کبابوں کا آنا تھا کہ باوجود کافی انسانیت کے (خدا ہر بلا ہر آفت سے بچائے) دسترخوان کی مکھی بن گئے' اور ڈٹکر اتنے کباب کھائے کہ مجبورًا چت لیٹنا پڑا۔ حالت یہ ہوی کہ تعریفی الفاظ اور خوشی کی ہی ہنسی کے قہقہے بھی پھنس پھنسکر منہ سے نکلنے لگے۔ کسی واعظ نے بھی شاید جنت کی اس قدر تعریف عمر بھر میں نہ کی ہوگی' جتنی اس قدر دان دیور نے اپنی شرافت سے ایک رات میں مدح خوانی کی۔ نوبت باینجا رسید کہ دوسروں کو بھی تعریف کے لئے مجبور کیا گیا اور ایک حاضر الوقت نمک حلال سے بھی فرمائش کی گئی کہ کچھ مدحیہ اشعار نظم کئے جائیں۔ اب آپ ہی خیال کیجیے کہ نظم کا کہنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ کھانے سے بیشتر اگر فرمائش کیجاتی تو ممکن بھی تھا کہ امید میں کچھ اچھے شعر نکلتے' ڈٹکر کھا چکنے کے بعد اول تو منہ سے بات نکلنا مشکل تھا دوسرے یہ کہ تعریف کی کوئی غرض باقی نہیں رہی تھی' اسلئے کہ تعریفی اشعار سے مکرر کبابوں کے آنے کی کیا امید ہوسکتی تھی بہرحال زید قاصر اور عذر کرتا رہا مگر کوئی معذرت مقبول نہیں ہوئی۔ یہانتک کہ الٹیمٹم دیدیا گیا کہ اگر نظم نہ لکھو گے تو لڑائی ہوجائیگی' اور آئندہ دعوتوں میں شرکت کا موقع نہ دیا جائیگا۔ مجبورًا بادلِ ناخواستہ کاغذ کا ٹکڑا کھلا پڑا تھا

دکھائے گئے، اور نذر کر دئے گئے۔ کچھ شعر ابتک کمی بیشی کے ساتھ یاد ہیں جو بطور نمونہ بلا تغیر یا اصلاح کے ناظرین اولڈ بوائے کے ملاحظہ کیلئے درج کئے جاتے ہیں تاکہ اُن کو پڑھکر اس قدر فطری اور ذوق سلیم کا اندازہ فرمایا جاسکے۔

مجھکو بھابی نے کھلائے جو مزیدار کباب — رشک سے جلکے ہوئے حاسد و اغیار کباب

بڑھکے تھی زلف معنبر سے بھی خوشبو انمیں — نقشۂ کاکُلِ پیچاں تھے گرہ دار کباب

پیاز کتری تھی کہ شفاف بندھا تھا سہرا — پہنکر آئے تھے یا تاج گہربار کباب

منتشر زلفِ پریشاں کیطرح ایک تھی انمیں — خندہ زن چاک گریباں کیطرح چار کباب

ایک تشبیہ تھی عالم کی نمایاں انمیں — روز روشن تھی اگر پیاز شب تار کباب

گر شکمپور نہ تھے وہ تو شکم پرور تھے — کیوں نہ تھے موجبِ لطفِ دل زار کباب

تپشِ آتشِ الفت میں پکایا ہی انھیں — کیوں نہ ہوں چشمِ محبت کے سزاوار کباب

کیا کروں بھابی کی احسانِ فراواں کا بیاں — کم پکانے کو کہا پک گئے بسیار کباب

اب میں جب ملتا ہوں بھابی سے کہا کرتا ہوں
اور کھلوائیے بھابی مجھے اک بار کباب

”وفا“

اولڈبواز

۱۔ اتحاد بین الملل کی ضرورت جیسی ان دنوں محسوس کیجارہی ہے کبھی نہیں ہوئی۔ اتحاد کانفرنس شملہ کے موقع پر ہمارے برادروں میں سے مولانا محمد علی، مولانا ظفر علی، مولانا حسرت موہانی، ڈاکٹر کچلو وغیرہ نے سر توڑ کوشش کی مگر کانفرنس ناکام ثابت ہوئی۔ اس موقع پر علیا حضرت سرکار عالیہ بھوپال، اور ہز ہائینس نواب سکندر صولت بہادر نیز ہز ہائینس مہاراجہ صاحب بہادر الور نے بطور خاص توجہ فرمائی تھی، مگر جہاں گائے اور باجے پر قومیت کا مدار ہو، وہاں قومی زندگی کی کیا توقع کیجا سکتی ہے۔ ہندو مسلمان بزرگوں کے شیر و شکر رہنے کے واقعات ابھی ہماری نگاہوں میں ہیں، اور ایسے حکایات کی صدا ہمارے کانوں میں گونج رہی ہے جن کے ذریعہ شادی و غم میں ایک دوسرے کی شرکت ضروری قرار پا جاتی تھی۔ ان واقعات و حکایات میں سیاست کو مطلق دخل نہ تھا، اور محبت و رواداری ہمارے پیش نظر رہا کرتی تھی۔ امن و امان کی خاطر اتحاد بین الملل کی ضرورت تو ہز اکسلنسی لارڈ ارون محسوس فرماتے ہوں گے، ہمیں تو ربط و محبت کی غرض سے ملک کی دو معظم قوموں کے اتفاق کی خواہش ہے۔ ہز ہائینس نواب صاحب بھوپال قابل مبارکباد ہیں کہ گزشتہ دسہرہ کے موقع پر مع ارکان اسٹاف شرکت فرما ہو کر اس تیوہار کو زینت بخشی۔ ہز ہائینس کے مندر میں پہنچنے پر ہندو معززین نے ہار پہنائے، اور سپاسنامہ عقیدت پیش کیا۔ آمد و روانگی کے مواقع پر تقریباً دس ہزار کے مجمع نے جے کے نعرے لگائے۔ ہماری خواہش ہے کہ دوسرے حصص ہند میں بھی اسکی تقلید کیجائے، اور دونوں ایک دوسرے کی تقاریب میں ضرور شرکت کرتے رہیں۔

۲۔ تھوڑے عرصہ سے ہم اس امر کو بیّن طور پر محسوس کر رہے تھے کہ نواب فخر یار جنگ میں داخلی

تغیر واقع ہورہا ہے، اور وہ مشاہدۂ فطرت کے بجائے مجاہدۂ نفس کے لئے ساعی ہیں۔ کسی شخص کو یہ بات حاصل ہوجائے تو وہ انسان بنجاتا ہے۔ کیا عجب ہے کہ بیرونی کشاکش اور مشاغل کی کثرت کے باوجود ہمارے برادرِ کرم ہجوم شوق میں کعبۂ دل کو لیکر مکہ، مدینہ، اور خدا معلوم کہاں کہاں پہونچے۔ حجاز، شام، اور عراق وغیرہ کے سفر کی آرزو پوری ہوی، تو ۲۰ ربیع الآخر کو صبح کے آٹھ بجے وارد حیدرآباد ہوئے۔ اس موقع پر کاچی گوڑہ اسٹیشن بیرقوں سے خوب سجایا گیا تھا، نیچے چاندنی کا فرش تھا۔ "حج مبارک" کے الفاظ بطور خاص نمایاں تھے۔ تقریباً ہر سررشتہ و صیغہ کے اعلیٰ عہدہ داروں سے لے کر چھوٹے ملازمین تک موجود تھے۔ ٹرین اسٹیشن پر پہنچی تو احباب نے نرغہ میں لے لیا۔ ان کی ہر دلعزیزی اس قدر غالب تھی کہ ہر شخص مصافحہ کی کوشش کرتا تھا اور اگرچہ اس باب میں ہمارے بھائی بھی بہت سخاوت سے کام لے رہے تھے، لیکن ظاہر ہے کہ ہزاروں کے مجمع کا کامیاب ہونا مشکل تھا۔ تقریب پذیرائی پر آپ کے احباب نے اس قدر ہار پہنائے کہ ناقابل برداشت ہوگئے، بلکہ کہتے ہیں کہ موٹر بھی پھولوں کے بار سے بوجھل ہوگئی۔ انجمن خادم المسلمین کے اہتمام نے نظم پڑھی ایک صاحب نے عربی قصیدہ سنایا، مسٹر مقصود احمد خاں نے تبریک نامہ پیش کیا۔ ان سب پر اظہار پسندیدگی فرماتے ہوئے، مسٹر فخرالدین احمد خاں اپنی موٹر تک پہنچے، اور گھر پہنچکر ہم سے مل کر پرانے ہوگئے۔

۳۔ یہ خبر سارے ملک میں مسرت کے ساتھ سنی گئی کہ ہز ہائینس مہاراجہ صاحب بجادر نے قاضی عزیز الدین خاں بہادر کے خلف الرشید قاضی امیرالدین صاحب کو اپنی ریاست کا دیوان مقرر فرمایا ہے۔ ہمارے بھائی اب تک صوبہ جات متحدہ میں سپرنٹنڈنٹ (مہتمم) ڈاکخانہ جات تھے، اور اب اپنے عم مرحوم قاضی خلیل الدین خاں بہادر کا منصب حاصل فرمایا ہے۔ اس مسرت بار موقع پر جناب یاقی خیرآبادی نے اپنے قطعہ میں مادہ تاریخ خوب نکالا ہے، فرماتے ہیں!

وزیر راجہ بجاور امیر خوش اقبال

۴۔ مسز سروجنی نائیڈو ایک مدت تک سیاسی فضا میں رہنے کے باعث خستہ حال ہوکر تھوڑے عرصہ کے لئے گھر میں بیٹھیں تو یہاں بھی ان کے دماغ نے چین نہ لیا، اور اس ملک کی آب و ہوا کے مناسب حال مقامی شعرا کو مجلس مشاعرہ گرم کرنے کا بلاوا دیدیا۔ مسٹر محمد اصغر، مسٹر شبیر حسن خاں جوش

مسٹر علی اختر اختر، مسٹر آغا حیدر، اور مسٹر سید غلام پنجتن شمشاد اس مجلس کی زینت تھے۔ خاص انداز میں مسٹر آغا حیدر اور حضرت شمشاد کی داد کالج کے مشاعروں کو یاد دلا رہی تھی۔ کہتے ہیں کہ جناب جوش کا کلام بہت سرسبز ہوا، اور پردہ والیاں بھی جوش میں آکر شاعر کی حوصلہ افزائی اپنی برمحل داد سے کرتی رہیں۔ مسٹر محمد اصغر کے دور افتادہ احباب خوش ہوں کہ اُن کے ایک بھائی کا انتخاب ایک بار اور حیدرآباد کی مجلس وضع قوانین کی رکنیت کے لئے ہوا ہے۔

۵۔ نواب ولی الدولہ بہادر کی دختر نیک اختر، اور ہمارے برادر عزیز محی الدین خاں بہادر کی ہمشیر جناب حشمت النسا بیگم صاحبہ کی شادی بتاریخ ۷ ربیع الآخر روز دوشنبہ بڑے تزک و احتشام کے ساتھ ایوان ولایت منزل بیگم پیٹھ میں، نواب معین الدولہ بہادر کے فرزند ظہیر الدین خاں بہادر کے ساتھ سوا لاکھ روپیہ اور پانچ دینار سرخ مہر پر ہوئی۔ دولہا اور دلہن دونوں کی جانب سے اس موقع پر بڑی حوصلہ مندی سے کام لیا گیا، اور جانبین سے کئی لاکھ کی رقم خطیر صرف کی گئی۔ خدا دونوں کو مبارک کرے۔ فطرت سادگی پسند ہے اور کیا اچھا ہو کہ ایسے مواقع پر مسلمان فطرت کا لحاظ کرتے رہیں۔

۶۔ ۲۰ ربیع الآخر کو ہمارے بھائیوں میں سے بھی ایک نے اپنی شادی رچائی تھی۔ مسٹر عبدالسلام ایم۔اے، جن کو علیگڈھ چھوڑے ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا، دولہا بن کر مولوی فیاض الدین صاحب وکیل کی دختر کے ساتھ شادی کرنے چلے تو اُن کے احباب اولڈبوائز کی ایک برات اُن کے ہمراہ تھی، اور رسم پذیرائی میں بھی اُن لوگوں کی کافی تعداد موجود تھی۔ ہم خوش ہیں کہ ہمارے بھائی اب متاہل زندگی میں داخل ہو گئے ہیں۔ ثمر آرزو کی تمنا انھیں ضرور ہوگی، اور ہم بھی اُن کی اس آرزو میں شریک ہیں۔

۷۔ اولڈبوائز ڈائرکٹری کے لئے برادرم مسٹر شمس الحسن زبیری (فتح آباد) نے ہمیں اپنے حالات روانہ کئے تھے، جن کو ہم اپنی اُس کتاب میں درج کریں گے۔ اُس وقت وہ یہ لکھنا بھول گئے تھے کہ علیگڈھ میں ان کے تفریحی مشاغل کیا تھے۔ ہماری درخواست پر اب انہوں نے مختصر سی تحریر روانہ فرمائی ہے۔ لکھتے ہیں:- پہلے میں مدرسہ میں تقریباً سب کھیلوں سے بھاگتا تھا۔ آخر دنوں میں کھیلنا شروع کیا تھا۔ ہاکی سے مجھے شوق رہا۔ کرکٹ اور ٹینس بھی فرماتا تھا۔ علیگڈھ کی کسی ٹیم میں رہ کر کوئی نمایاں حصہ نہیں لیا، لیکن اپنی سائیڈ کی ٹیم کا

ممبر رہا، اور برابر چار سال لیگ میچز میں شریک ہوا۔ علمی سوسائٹیوں پر میں نے کبھی احسان نہیں کیا، اور نہ اُن کا مرہونِ منت ہوا" کیا اچھا ہو کہ دوسرے بھائی بھی جلد اس جانب توجہ فرما کر مجھے منت پزیر بنائیں۔ برادرم صدیق الزماں صاحب کے ہم ممنون ہیں کہ اپنے احباب میں اس تحریک کی اشاعت فرما رہے ہیں۔

۸۔ اکتوبر نمبر پا کر بعض بھائیوں نے خیر مقدم بھی فرمایا ہے۔ ہم رفتہ رفتہ ان تحریروں کو درج رسالہ کرتے رہینگے۔ بلند شہر سے مسٹر منظور حسین اپنی رووداد میں تحریر فرماتے ہیں کہ آپ کو شاید یہ معلوم کر کے افسوس ہوگا کہ میری اہلیۂ ثانی کا انتقال ۲۲ رمارچ ۱۹۲۶ء کو ہوگیا، اور اُس زمانہ سے میری زندگی میں ایک خاص ناکامیابی واقع ہوگئی ہے۔ صحت بھی اچھی نہیں ہے، اور طبیعت مکدّر ہے۔ شاید زیدی (بریمبنی) کو بھی اس واقعہ کا ابھی تک علم نہیں ہے۔ ہمیں اپنے بھائی سے اس غم میں دلی ہمدردی ہے۔ انسان وہی ہے جو صبر کے ساتھ مصائب کا مقابلہ کرے، اور ہم اس کی امید منظور سے بھی رکھتے ہیں۔ زیدی اپنے کام میں مشغول اور مگن ہیں۔

۹۔ سردار سلطان احمد خاں بہادر (گوالیار) کی خاتون محترمہ ایک اپریشن کے سلسلہ میں کلکتہ تشریف لے گئی تھیں، لیکن جانبر نہ ہوسکیں، اور ۸ راکتوبر کو کلکتہ ہی میں انتقال فرمایا۔ ایک روز بعد کلکتہ سے لاش روانہ ہوئی، اور اُسی روز گوالیار میں تجہیز و تکفین عمل میں آئی۔ اس موقع پر بڑی مہارانی صاحبہ اور صاحب رزیڈنٹ کے سوا تمام انگریز و ہندوستانی حکام و خواتین نے شرکت فرمائی۔ مسز لوسی سلطان احمد فنِ نقاشی کی ماہر کامل ہونے کے باعث سارے ملک میں شہرت عام رکھتی تھیں۔ خدا ہمارے برادر محترم کو توفیق صبر عطا فرمائے۔

۱۰۔ ہمیں یہ اطلاع پا کر قلق ہوا کہ برادر مکرم مسٹر عبد المجید خاں (حیدر آباد) کی نوزائیدہ نواسی نے وفات پائی۔ خدا ماں کو صبر اور نعم البدل عطا فرمائے، اور بعافیت رکھے۔ اسی طرح ہمیں برادر عزیز مسٹر سرور حسین (علیگڈھ) کے رسالہ بھانجے کے حیدر آباد میں یکایک حوض میں غرق ہونے کی اطلاع پا کر کمال صدمہ ہوا۔ خداوند عالم بچہ کے والد خواجہ حبیب حسن صاحب اور والدہ کو صبر عطا فرمائے، اور بہتر بدل عنایت کرے۔

۱۱۔ برادر محترم مولوی مرزا محمد بہادر صاحب ارقام فرماتے ہیں:۔ یوسف سلمہٗ وسط نومبر میں یہاں

پہنچیں گے، مناسب ہوگا کہ خود اُن کے قلم سے اُن کے حالات کا اقتباس حاصل کیا جائے۔ جذبات یا ور طبع ہو چکے ہیں۔ کچھ قطعات باقی ہیں۔ عنقریب جلد مکمل ہو جائے گی۔ رسالہ کی مدد کے لئے میں ہر طرح سے تیار ہوں۔

۱۲۔ خان بہادر سردار محمد اشرف خاں صاحب پولیٹکل ایم۔ بی۔ ای مشہد سے واپس آکر اپنے وطن گجرات میں مقیم ہیں۔ انکی خدمت میں ہم نے رسالہ روانہ کیا، اور دائرکٹری کے لئے اُن سے حالات مانگے تو جواب میں ارقام فرماتے ہیں۔ "میرے حالات بہت سارے ہیں، ایام تعلیم، سروس، آوارگی، گمنامی، مایوسی، بیکاری، اور ایک بڑا کام جو پیش نظر ہے۔ آپ کونسے حالات چاہتے ہیں......... آپ کو یاد ہوگا کہ آپ نے اقوال حضرت علی کرم اللہ وجہٗ لکھے تھے، میرے پاس اس کی دو کاپیاں تھیں، لیکن گم ہوگئیں۔ اس کی ایک اور کاپی مل جائے تو مناسب ہے۔" ہم اپنے بھائی کے ہر قسم کے حالات کے طالب ہیں، بعض کو ڈائرکٹری میں درج کریں گے، بعض سے اولڈبوائے میں کام لیں گے اور چند ہمارے سینہ میں محفوظ رہ کر روایات کی شکل اختیار کریں گے۔ بہرطور سب کچھ لکھیں، اور سب بھائی اسکو پیش نظر رکھیں۔

۱۳۔ مسٹر خواجہ منور حسن بی۔ اے (علیگ) نے اپنے عم محترم جناب خواجہ جعفر حسن صاحب مرحوم کے مجموعہ مراثی کو ہمیں بغرض ریویو مرحمت فرمایا ہے۔ یہ مجموعہ "اشعار مرثیہ" کے نام سے حال ہی میں حیدرآباد دکن سے شائع ہوا ہے۔ جناب مولوی وحید الدین صاحب سلیم پانی پتی نے اس پر مقدمہ لکھا ہے۔ اس میں حضرت خواجہ صاحب مرحوم کے حالات (جو مولوی صاحب کو معلوم تھے) درج کئے ہیں، اور ظاہر فرمایا ہے کہ تقریباً پینسٹھ سال تک مشق سخن فرماتے رہے تھے۔ مجموعہ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سلاموں کے سوا مصنف نے مخمسات و رباعیات پر بھی زور طبع صرف فرمایا ہے۔ ایسے کہنہ مشق اُستاد کا کلام ہمارے نزدیک ضرور اس قابل ہے کہ ملک میں اس کی قدر کیجائے۔ یہ مجموعہ مراثی خواجہ منور حسن صاحب سے سیف آباد، حیدرآباد دکن کے پتہ پر دو روپیہ میں مل سکتا ہے۔

۱۴۔ اوائل سال حال میں جن لوگوں کو حیدرآباد ہائیکورٹ سے سند وکالت عطا ہوئی ہے، ان میں ہمارے بھائی خلیب محبوب حسین، محمد ولی الدین، اور سید حیدر حسین صاحبان بھی شریک ہیں۔ اسی طرح

مولوی سید سراج الحسن صاحب ترمذی کو نئے دائمی وکالت عطا ہوئی۔ ہم ان سب کی کامیابی کے آرزومند ہیں۔

۱۵۔ برادر عزیز مسٹر منظور حسین نقوی (جالنہ) نے ہم سے خواہش کی ہے کہ ہم ہر بھائی کے نام کے قبل لفظ "بھائی" کا اضافہ ضرور کیا کریں، اور اپنے قائم کردہ دستور قدیم کو ترک نہ کریں۔ ہم اپنے برادر عزیز کے ارشاد کی تعمیل ضرور کریں گے۔

۱۶۔ کہتے ہیں کہ پچھلی دیوالی میں ہمارے برادر بزرگ سید سجاد حیدر صاحب نے اپنی مختصر سی جماعت کے ساتھ خوب ہولی کھیلی، اور اس طرف کے برادران طریقت یہ کہتے رہ گئے ؎

اب کے بھی دن بہار کے یونہی گذر گئے

ہم اپنے بھائی سے مستدعی ہیں کہ علیگڈہ کے چھوٹے بڑے جلسوں کی روئداد ہمارے پاس روانہ فرما دیا کریں، اور دور افتادہ بھائیوں کو بھی اپنے قریب ہی خیال فرما کر اپنی مسرتوں میں غائبانہ شرکت کا موقع دیں۔

۱۷۔ مسئلہ تعلیم سے ہمارے بھائی حافظ ہدایت حسین خاں بہادر بیرسٹر کانپور کی دلبستگی مسلم ہے۔ اسیطرح ہندو مسلم اتحاد کے لئے اُن کے مساعی قابل قدر۔ فساد کانپور کے زمانہ میں اُنکا یہ طریق کار لائق صد ہزار ستائش رہا کہ اُنہوں نے ہندو باشندگانِ شہر کی حفاظت مسلمانوں کے ذریعہ سے کئے جانے کا انتظام کیا۔ اس موقع پر ہم اپنے بھائی کو محض اُن کے خطبۂ صدارت کے باعث یاد کر رہے ہیں۔ حافظ صاحب نے یہ خطبہ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس صوبہ جات متحدہ کے اجلاس پنجم، منعقدہ فرخ آباد میں بتاریخ ۲۳ اکتوبر ۱۹۲۶ء، ارشاد فرمایا تھا۔ ہم اُن کے شکر گزار ہیں کہ اُنہوں نے ہمیں بروقت یاد رکھا۔ جو مطبوعہ خطبہ ہمارے پاس آیا ہے اُس سے واضح ہوتا ہے کہ صوبہ جات متحدہ کی کل آبادی (۴۵۳۷۵۸۰۶) کے منجملہ، مسلمانوں کی تعداد (۶۴۸۱۰۳۲) یا ۱۴ء۵ فیصدی ہے۔ لیکن قدیم تعلیم و تہذیب کے اس گہوارہ میں مسلمان اپنی اوسط کے نصف بھی خواندہ نظر نہیں آتے۔ مغل، جو اپنے دور کے آخر آخر اس سرزمین کے حکمران تھے، فی ہزار (۱۴۵) سے زیادہ اُن میں اب پڑھے لکھے نہیں ہیں۔ اسی طرح سادات جو اسلامی تعلیم و تہذیب کے علم بردار رہے ہیں، فی ہزار (۲۱۰) ہی خواندہ ہیں۔ ان دو موقر جماعتوں کی حالت یہ ہے تو دوسرے مسلمان کس شمار میں ہوں گے۔ اپنے خطبہ کے سلسلہ میں حافظ صاحب نے حکومت برطانیہ کی عنایتوں کا ذکر بھی فرمایا ہے، امداد مسٹر کٹ بوبڈ ڈیبونسل بورڈ

میں کثیر التعداد برادرانِ وطن کے سلوک کا تذکرہ بھی کیا ہے، اور ساتھ ہی یہ بھی بتایا ہے کہ ایام گذشتہ میں ثانوی تعلیم پر اپنے ہمسایوں کے پانچ آنہ کے مقابلہ میں مسلمانوں نے صرف پانچ پیسے صرف کئے ہیں بمعاشیاتی درسگاہوں میں ہماری جو حالت ہے، اگر یونیورسٹی تعلیم کے بعد اُس کی حالت بھی بیان کر دیجاتی تو اچھا تھا شروع سے آخر تک خطبہ دلچسپ ہے، اور ہم چاہتے ہیں کہ کثرت سے پڑھا جائے۔

۱۸۔ علیگڈھ کے کھلنڈرے جہاں دس بیس کی تعداد میں جمع ہو گئے، اپنا رنگ جمانا اور رعب گانٹھنا شروع کر دیا۔ حیدرآباد توان مردوں کا میدان، اور ان شیروں کا بیشہ ہے۔ اوائل ماہ نومبر میں سکندرآباد ریس کورس پر کواڈ رینگلر کرکیٹ کا آغاز نہایت خوبی کے ساتھ ہوا، اور اُس کے خاتمہ میں بھی شادمانی و فتحمندی ہمارے شریک حال رہی۔ ابتدائی مقابلہ انگریزوں اور پارسیوں کے درمیان تھا۔ اس میں آخرالذکر کو فتح حاصل ہوئی۔ اس کے بعد مسلمانوں اور ہندوؤں کے جوڑ میدان میں اترے، اگرچہ مقابلہ سخت تھا لیکن میدان اول الذکر کے ہاتھ رہا۔ فائنل ایک دن کے وقفہ سے ہوا۔ اب مسلمانوں کا مقابلہ پارسیوں سے تھا۔ اس میں بھی مسلمان، بازی لے گئے۔ مسلمانوں کی ٹیم میں آٹھ کھلنڈرے علیگڈھ کے شریک تھے، اور اس الیون کی کپتانی کی عزت بھی علیگڈھ کے ایک کھلنڈرے لفٹنٹ سید محمد حسین کو حاصل تھی۔ کپتان محمود حسن خاں، جنہوں نے پورے کواڈ رینگلر میں صدی سے بارہ دوڑیں زیادہ بنائیں، اس ہجم کے ہیرو تھے، نہ صرف اپنی بیٹنگ کے لحاظ سے، بلکہ بولنگ کے لحاظ سے بھی۔ ان کی بہت سی بونڈریوں کے منجملہ ایک اور باونڈری بھی تھی۔ خود الیون کے کپتان صاحب کی بیٹنگ کی شہرت دور دور ہے، اور ہم نے ایسا محسوس کیا کہ وکٹ کیپنگ میں بھی انہوں نے بڑی مستعدی سے کام لیا تھا۔ مسٹر حمایت اللہ ننانوے کے پھیر میں رہے، گر موقعہ کو بنا لے گئے۔ ان کی اور باونڈری بھی قابل تحسین ہے۔ مسٹر سید محمد ہادی کی بیٹنگ اور فیلڈنگ بہت کامیاب ثابت ہوئی۔ ہمارے کھلنڈروں میں مسٹر محمود علی سدا بہتی ہیں۔ ان کے رنوں کی تعداد تو تیس کے ادھر اُدھر رہی لیکن جتنی دیر کھیلے جم کر، اور شان کے ساتھ کھیلے۔ البتہ مسٹر اصغر علی ٹوگو نے اپنے آخری کھیل میں بڑی پامردی دکھائی، اور کئی باونڈریوں کے ساتھ ایک اور باونڈری کے بھی مالک ہو گئے۔ بھائی کھلنڈروں میں سے لفٹنٹ امیر احمد اور مسٹر فتح خاں قابل ذکر ہیں۔ مسلم الیون نتیجہ پر مقررہ انعامات کی

مستحق قرار پائی۔ ہمارے بھائی کپتان محمود حسن خانصاحب نے سب سے زیادہ دوڑوں کے صلہ میں فرینڈز یونین کلب کا نقرئی پیالہ' سب سے زیادہ باونڈریاں بنانے کے صلہ میں سر فریدون الملک کا بیٹ' اور فائنل میں سب سے زیادہ رن بنانے کے صلہ میں ایک دستی گھڑی' اور ایک ریکٹ حاصل کیا۔ ہم کپتان محمود حسن خاں اور الیون کے کپتان لفٹنٹ سید محمد حسین کی خدمت میں اس نمایاں کامیابی پر ہدیہ مبارکباد پیش کرتے ہیں' اور متوقع ہیں کہ آئندہ جب کبھی ایسا موقع پیش آئے تو اُس سے مقابلہ کرنے کے لئے اُن کی پوری ٹیم ہر طرح تیار پائی جائے گی۔ نواب بہرام الدولہ کے دو فرزند میر تراب علیخاں بہادر و میر زین العابدین خاں بہادر ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں کہ دوران مقابلہ میں نہ صرف ان کھلاڑیوں کے ساتھ اپنی عملی دلچسپی کا اظہار ہر موقع پر فرماتے رہے' بلکہ تماشائیوں کی مدارت کا بھی خیال رکھا۔

۱۹۔ ہمارے جو بھائی حال ہی میں ولایت سے وطن واپس آئے ہیں اُن میں ڈاکٹر عبدالرحمٰن' ڈاکٹر جعفر حسین' اور مسٹر سید اعظم الدین حسن قابل ذکر ہیں۔ اول الذکر نے اڈنبرا سے طب میں سند تکمیل حاصل فرمائی ہے' اور ثانی الذکر پی۔ ایچ۔ ڈی ہو کر آئے ہیں۔ سید اعظم الدین حسن صاحب نے محاسبی کی سند لی ہے۔ ہم اپنے ان بھائیوں کا خیر مقدم کرتے ہیں' اور اُمید کرتے ہیں کہ انکی بابت تفصیلات دینے کا ہمیں آئندہ موقع ملیگا۔

۲۰۔ کپتان محمود حسن خانصاحب کو کو اڈر بنگلر کے موقع پر (۱) مہاراجہ سرکشن پرشاد یمین السلطنتہ نے ایک طلائی رسٹ واچ سرفراز فرمائی (۲) نواب سر فریدوں ملک بہادر نے ایک کرکیٹ بیٹ عطا کیا (۳) نواب کاظم علیخاں بہادر نے ایک چاندی کا کپ عنایت کیا (۴) فرینڈز یونین نے ایک چاندی کا بڑا پیالہ دیا۔ اور (۵) عبدالغفور رونگا درس نے دو کرکیٹ بیٹ نذر کئے۔

قاسم حسن صاحب (مولوی ....) خلف مولوی وزیر احمد صاحب بی۔ اے (علیگ) نواب صاحب مرحوم والیٔ ٹونک کی سلک ملازمت میں مسٹر قاسم حسن کے دادا اور نانا دونوں تھے، اور دونوں کو سر سید احمد خاں مرحوم سے ملنے، اور اُن کے مقاصد سے اثر پذیر ہونے کا موقع ملا، اور پھر تا بعمر ساتھ رہا۔ ان بزرگوں کے تقریباً تمام اخلاف، کالج کی تعلیم سے بہرہ اندوز ہوئے۔ مولوی وزیر احمد صاحب، جو کالج میں "ٹونک والا" کے نام سے شہرت عام رکھتے تھے، سید محمود مرحوم کے شاگردانِ خاص میں سے تھے۔ اسی طرح مسٹر ابن احمد مرحوم (بیرسٹر الہ آباد) کی یاد اب تک بہت سے اولڈ بوائز کے دلوں میں تازہ ہی۔

قاسم حسن صاحب کی ولادت دوشنبہ واقع ۲۳ر جون ۱۸۶۹ء کو اُن کے وطن بدایون میں واقع ہوئی۔ اُردو، فارسی، اور ابتدائی انگریزی گھر پر پڑھی۔ مولوی انعام اللہ صاحب سنبھلی، برادر شمس العلما مولوی خلیل احمد صاحب مرحوم اُس زمانہ کے اساتذہ میں سے ایک تھے۔ فروری ۱۸۸۵ء میں ہمارے اسکول کی جماعت چہارم میں داخل ہوکر ایف۔ اے تک تعلیم علیگڈھ ہی میں پاتے رہے۔ اِس عرصہ میں ایک مرتبہ بریلی، اور ایک بار الہ آباد گئے، مگر دونوں مقامات کی تعلیمی فضا اِن کے مناسبِ حال نہ تھی، اس لئے پھر علیگڈھ واپس آگئے۔ دورانِ تعلیم میں پارٹیوں کے انتظام میں بطورِ خاص حصہ لیتے، اور جب کبھی کوئی بڑا آدمی آتا، کالج کے سجانے میں پیش پیش نظر آتے تھے۔ کالج میں اِن کا نام "چوکیدار" تھا۔

سر تھیوڈور مارین کی توجہ سے، کالج کو خیرباد کہہ کر، ملازمت کیجانب مائل ہوئے، اور ۱۸۹۰ء میں صوبہ جات متحدہ میں، نائب تحصیلداری کی خدمت پر مامور ہوگئے۔ بعد کو تحصیلدار ہوئے، اور پھر ڈپٹی کلکٹری

امتحان میں بدرجۂ اعلیٰ کامیاب ہو کر اس خدمت کو حاصل کیا۔ آخر الذکر عہدہ کے فرائض اس طنطنہ کے ساتھ انجام دیے کہ حکام مافوق کو ان کی قابلیت کا اقرار کرنا پڑا۔ الہ آباد کے ایک مشہور مقدمہ میں بعض وکلا سے ان بَن ہو گئی، اور ان کے اثر سے صوبہ کی کونسل، بلکہ پارلیمنٹ میں، مسٹر قاسم حسن کے طرز کار کی بابت استفسارات ہوئے۔ کونسل کے سرکاری جواب میں بیان کیا گیا تھا کہ ڈپٹی مجسٹریٹ نے تصفیۂ مقدمات میں، ایمانداری اور قابلیت سے کام لیا ہے۔ ۱۹۱۸ء میں اپنی خدمت سے استعفا دیا، اور تین مہینے کے بعد ہی، نواب نذیر جنگ بہادر کی سعی بلیغ سے، حضور پرنور نے اپنے علاقۂ مال میں پانچ سو روپیہ ماہانہ کی خدمت دوم تعلقدار کا فرمان جاری فرمایا۔ اس وقت سے سرکار آصفیہ کے متوسل، اور فارغ الامتحان زبان ملکی (مرہٹی) ہیں۔ اپریل ۱۹۱۸ء میں، منجانب اولڈ بوائز ایسوسی ایشن، پانچ سال کے لئے محمڈن کالج کے ٹرسٹی منتخب ہوئے، پھر یونیورسٹی کورٹ کے پہلے بیچ کے ممبر رہے۔ اس عرصہ میں، جلسوں میں شرکت کرتے، اور علیگڈھ کے مقاصد سے، دلچسپی کا اظہار فرماتے رہے۔ اپنی زندگی میں چار مرتبہ سخت علیل ہوئے۔ دو مرتبہ مسیح الملک حکیم محمد اجمل خاں کے معالجہ، اور دو بار ڈاکٹر انصاری کے اپریشن سے، صحت پائی۔ زمانۂ علالت میں مولانا محمد علی، اور خواجہ عبدالمجید صاحبان نے، تیمارداری اور برادرانہ معاونت میں جو حصہ لیا تھا، اب بھی انھیں یاد ہے۔ اندرون ملک مختلف حصص ہند کا سفر کر چکے ہیں، مگر تصنیف و تالیف کے باب میں فرماتے ہیں کہ اللہ پاک نے، اس سے اب تک تو معاف رکھا ہے۔ نو سال کے سن میں شادی ہوی۔ اس جوڑے کے ثمر آرزو (عبدالحفیظ) نے، بیس سال کی عمر میں، انفلوانزا سے ۱۹۲۰ء میں وفات پائی۔ اولاد میں اب ایک صاحبزادی باقی ہیں، خدا باقی رکھے۔

ماوشما

ا۔ علیگڈھ کی تازہ دلچسپ خبروں میں سے یہ خبر سنکر ہم کو خاص خوشی ہوئی کہ ہمارے محترم کرمفرما نواب سید نصیر حسین صاحب خیال (ٹرسٹی و ممبر کورٹ مسلم یونیورسٹی) نے ماہ نومبر میں ہماری یونیورسٹی کے معائنہ اور وہاں کے موجودہ حالات و فضا سے آشنا ہونے کا قصد فرمایا ہے۔ نواب صاحب کا قیام وہاں کئی ہفتہ رہے گا اور ممدوح اس اثنا میں یونیورسٹی کے شعبہ جات کو ملاحظہ اور وہاں کے طریقۂ کار کا مطالعہ فرمائیں گے۔ ہم کو اس امر کے اظہار کی ضرورت نہیں کہ ہمارے ممدوح کو اپنی اس قومی درسگاہ کے ساتھ کتنے قدیمی تعلقات ہیں۔ انہوں نے مدرسۃ العلوم کو سر سیّد علیہ الرحمۃ کے زمانہ اور سب سے پہلے غالباً سنہ ۱۸۹۴ء میں دیکھا، اور جب سے وہ ہمارے کالج کے ساتھ خاص دلچسپی لیتے اور اس کے خدمات کرتے رہے ہیں۔ نواب محسن الملک کے زمانہ میں، سال میں دو مرتبہ علی گڈھ کا حج آپ پر فرض تھا۔ جہاں نواب مرحوم کے مہمان عزیز بنے ہوئے احرام باندھے، مناسک و ارکان بجالاتے رہتے تھے۔ اس دورے کے علاوہ ممدوح خاص موقعوں پر بھی علیگڈھ طلب کئے جاتے اور معاملات کالج میں درخور رکھتے تھے۔ ہمارے موجودہ بادشاہ (جارج پنجم) بزمانۂ ولیعہدی، کالج کے ملاحظہ کو تشریف لے گئے تو اسوقت بھی ہمارے کرمفرما وہاں حاضر اور ٹرسٹیاں و بہی خواہان کالج کے ہمدوش کام کرتے اور ہز ہائی نس آغاخاں کے دہنے بازو بنے ہوئے تھے۔ پھر جبکہ ہز مجسٹی امیر حبیب اللہ خاں علیگڈھ تشریف لائے تو اس موقعۂ خاص پر بھی آپ مدعو ہوئے اور اپنے معظم نواب محسن الملک کے ساتھ، شاہِ شہید کی پذیرائی و استقبال میں مصروف دکھائی دئے۔ سنہ ۱۹ء میں آپ کالج کے ٹرسٹی مقرر ہوئے اور اس کے بعد نواب وقار الملک کے ساتھ بھی کام کرنے کا آپ کو اچھا موقعہ ملا۔ اس وقت سے اس وقت تک کہ زمانہ کے

تغیرات نے حالات بہت بدل دیئے اور اکثر بزرگوار اور ہمارے پرانے ٹرسٹیوں کا شغف بھی سرد پڑ گیا، ہمارے کالج کے ساتھ آپ کے انہماک میں الحمد للہ ابتک کوئی فرق دکھائی نہیں دیا، اور یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ کالج کی جوبلی کے موقعہ پر بھی آپ شریک اور گذشتہ سال کے یونیورسٹی کانووکیشن کے ایام میں بھی گون پہنے آپ وہاں نمایاں حصہ لے رہے تھے۔

ہم کو ابتک اس کا علم نہیں کہ ہمارے کرم فرما اس دفعہ بغیر کسی خاص تقریب کے کس مقصد سے اپنے اس قومی انسٹی ٹیوشن کے ملاحظہ کو جا رہے ہیں۔ مگر ہم اولڈ بوائے کی طرف سے بہ تپاک ان کا خیر مقدم کرتے اور اسے ایک نیک فال جانتے اور سمجھتے ہیں کہ ان کے اس اقدام سے ہمارے دیگر بزرگان، ٹرسٹیان اور ممبران کورٹ کا بھی حوصلہ بڑھے گا اور پھر بہت سے بچھڑے بہ آسانی مل جائینگے۔

اس موقعہ پر ہم اپنے مخدوم سے اتنا ضرور کہیں گے کہ آپ نے محسن الملک کی آنکھیں دیکھی اور معاملات کالج سے ہمیشہ باخبر رہے ہیں۔ بیس سال قبل کے زمین و آسمان اور موجودہ فضا کے فرق کو آپ سے زیادہ کون محسوس کر سکتا اور آج کی آب و ہوا کو سمجھکر آپ چند حضرات کے سوا ہمارے آرام کی خاطر دوسرا کون صحیح نسخہ تجویز کر سکتا ہے۔ مخدومنا! آپ نے اپنے سفر یورپ میں وہاں کی تقریباً کل درسگاہوں کو ملاحظہ بلکہ ان کا مطالعہ کیا ہے، اور اپنی کیمبرج یونیورسٹی یونین والی اسپیچ میں بھی آپ ہمارے کالج کو بھولے نہیں ہیں اور برلن یونیورسٹی کے ساتھ مصر کی قدیم جامع ازہر میں بھی اپنے وقت کا کافی حصہ آپ نے صرف کیا ہے۔ آپکا تجربہ تعلیمی معاملات میں اور زیادہ وسیع و وقیع ہو گیا ہے۔ اس لحاظ سے ہم کو پوری امید ہے کہ آپ کی یہ قابل تقلید وزٹ .... ہمارے بہت سے مراحل طے کر دے گی۔

ہم اخیر میں اپنے اولڈ بوائے کی طرف سے گستاخانہ اتنا اور عرض کریں گے کہ ہماری زمین پر پہنچکر اور وہاں کی موجودہ آب و ہوا سے آشنا ہو کر اپنے خیالات اگر آپ نے ہماری زبان سے ادا نہ کئے تو ہم کو سخت شکایت ہوگی۔ آپ کو علم ہے کہ ہم اولڈ بوائے آپ کے حرف حرف کو تعویذ اور حرز جان سمجھتے اور آپ کے قلم کی ہر گردش پر سمرقند و بخارا کیا، دل و جان بخشدینے پر تیار ہیں۔ اب اگر آپ نے سرد مہری برتی اور یہ اولڈ بوائے آپ کا آلۂ زبان نہ بنا تو ہم سے کھلنڈرے اور بہروپئے، پھر ایک بھوکے بنگالی کی طرح

پیٹ بجا بجا کر اور چیخ چیخ کر جناب کی عافیت تنگ کردیں گے!!

۲۔ گزشتہ دیوالی کی تعطیلات میں جناب نواب ذوالقدر جنگ بہادر کی صدارت میں دوسری دفعہ حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس نہایت کامیابی کے ساتھ ہوتے رہے۔ اس کامیابی کا سہرا یقیناً کانفرنس کے سکرٹری مولوی سید خورشید علی صاحب کے سر ہے، جنہوں نے تھوڑے عرصہ سے اس کو اپنے ہاتھ میں لے کر ملک کا ایک مفید ادارہ بنانے کی سعی کی ہے۔ ہم نواب ذوالقدر جنگ بہادر کے خطبہ کو دیکھتے ہیں، تو ہمیں اس مختصر میں صفائی، اور سچائی کے سوا دو باتیں بطور خاص نظر آتی ہیں، ایک زنانہ تعلیم پر اظہار خیال اور دوسرے پست طبقہ کی تعلیم پر زور۔ بہ حیثیت معتمد حکومت ہونے کے نواب صاحب کے لئے یہ قدرتی بات تھی کہ لازمی ابتدائی تعلیم پر اپنے خیالات کا اظہار فرماتے۔ ہم ان کی اس آرزو میں شریک ہیں۔ اگرچہ حکومت آصفیہ کی جانب سے اب بھی ابتدائی تعلیم عام اور مفت ہے، لیکن ہمارا مشاہدہ ہے کہ اہل ملک خود ہی اس برکت عثمانی سے کافی فائدہ حاصل نہیں کر رہے ہیں۔

کانفرنس کے پروگرام کو کامیاب بنانے میں ہمارے بھائیوں میں سے نواب فخر یار جنگ بہادر، نواب ناظر یار جنگ بہادر، مولوی سید محمد حسن صاحب بلگرامی، لفٹنٹ کرنل محمد عظمت اللہ سردار بہادر، مولوی غلام احمد خاں صاحب، اور مولوی مظہر حسین صاحب کی سعی بلیغ قابل قدر ہے۔ آخرالذکر نے تو اپنے محکمہ زراعت کی ضروریات کو بھی اس موقع پر بطور نمائش کے پیش فرمایا تھا۔ امید کہ دوسرے کارفرما بھی اس جانب متوجہ ہوں گے، اور آیندہ نمائش کانفرنس میں ملک کی مختلف قسم کی علمی و صنعتی پیداوار بھی نظر آئے گی۔

۳۔ مولوی محمد عظمت اللہ خاں صاحب مددگار ناظم تعلیمات مملکت آصفیہ کی وفات عالم ادب کے لئے ایک تکلیف دہ سانحہ ہے، اور ہمارے لئے کبھی فراموش نہ ہونیوالا واقعہ۔ شروع سے آخر تک کامیاب طالبعلمانہ زندگی بسر کر کے مرحوم نے اجمیر کالج سے بی۔ اے کے امتحان میں اعزاز کے ساتھ کامیابی حاصل فرمائی اور ایک اخبار نویس کی زندگی اختیار کرنے کی خاطر دہلی و حیدرآباد میں مطالعہ میں مشغول ہو گئے۔ ٹھیک اسی زمانہ میں حیدرآباد کے تعلیمی مسئلہ پر مرحوم کا ایک مختصر سا انگریزی مضمون ڈاکٹر الماللطیفی کی نظر سے

گزرا، اور انہوں نے اسے پسند فرماکر اپنے آخری دورِ نظامت میں اُن کا انتخاب سرکارِ آصفیہ کے محکمۂ تعلیمات کیلئے فرمالیا۔ اس طرح سے مولوی عظمت اللہ خاں صاحب کی سرکاری زندگی کی ابتداء ورنگل ہائی اسکول کے ایک معلم کی حیثیت سے ہوئی۔ محض اپنی قابلیت کے باعث مرحوم کو تھوڑے عرصہ کے بعد ہی نظامت تعلیمات میں جگہ ملی، اور اس کے بعد سے وہ کبھی باہر نہ گئے۔ بحیثیت مددگار ناظم تعلیمات ومعتمد کمشنر امتحانات خانصاحب کا کام تو سرکاری فائلوں میں بند رہے گا، لیکن یہ راز اب فاش ہوچکا ہے کہ جامعہ عثمانیہ کی تاسیس کے زمانہ میں جو اصول کار مرحوم نے قرار دیا تھا، اسی کے مطابق ابتک عملدرآمد ہے۔ اسی طرح محکمۂ تعلیمات کی گزشتہ سالانہ رپورٹوں کی خوبی کا مدار بھی تمام تر اُن مرحوم کی قلمکاری پر ہے۔ اس فریضہ کو وہ اپنی زندگی کے اُس نازک زمانہ میں بھی انجام دیتے ہوئے پائے گئے، جب مرض دق میں مبتلا ہوکر گھر میں زیرِ علاج تھے۔ مولوی عظمت اللہ خاں صاحب کا شمار ملک کے نثر نگاروں میں ہوتا تھا، اور اپنی اس حیثیت سے تمام موقر رسائل کی قلمی معاونت فرماتے رہتے تھے۔ اپنی مادری زبان کیطرح انگریزی انشاپردازی، بلکہ شاعری پر بھی مرحوم قادر تھے۔ رسالہ المعلم کے خود بھی دل سوز مدیر تھے، اور اس رسالہ کی کامیابی زیادہ تر مرحوم ہی کی رہینِ منت ہے۔ شاعری میں اُن کی رائے دوسرے شعراءِ عصر سے جدا تھی، اور اس باب میں نوجوانانِ ملک کیلئے ایک نیا راستہ پیدا کرنا چاہتے تھے۔ اُنکی سرکاری رائے ہمیشہ مصنفین ومولفین کے شریکِ حال رہا کرتی تھی، اور ان سے بہت سے اہلِ قلم فائدہ حاصل کرچکے ہیں۔ ان مشاغل سے جب کبھی فرصت ملتی تھی، امتحانات میں تیار ہونے والے طلبہ کو مدد دیا کرتے تھے۔ انہیں سے کسی میں بھی ذاتی منفعت کو دخل نہیں تھا۔ یہ امر بھی بطورِ خاص قابلِ اظہار ہے کہ مرزا رفیق بیگ صاحب جس قسم کے اُردو ٹائپ کی تیاریاں کررہے ہیں، اسکی کامیابی ایک بڑی حد تک خانصاحب مرحوم کی رہنمائی اور مفید مشوروں کا نتیجہ ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اس ٹائپ کی کامیابی کا سہرا عظمت اللہ خاں کے مرنے کے بعد کن بزرگوار کے سر باندھا جاتا ہے۔ وہ ایک تیسرے درجہ کے مددگار تعلیم تھے، اور انہوں نے کبھی آگے بڑھنے کی سعی نہ کی! بلکہ ایک دو بار تو ایسا بھی ہوا کہ معتمدی عدالت اور فوج سے اُنکی مانگ آئی مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی دوست نے خود تعلیمات میں ترقی کے متوقع رہنے کی صلاح دی، اور مرحوم اپنی اس حالت پر قانع ہوگئے۔ بالآخر جذبۂ غیرت سے اثر پذیر ہوکر انکی طبیعت نے دائمی حرارت کو قبول کرلیا..... وفات سے چند ہفتہ قبل دق کا علاج کرانے دہلی تشریف لیگئے تھے مگر وہاں فالج کے شکار ہوگئے اور وہیں پیوندِ خاک ہوگئے۔ خدا مرحوم کے پسماندوں کو صبرِ جمیل عطا فرمائے اور اربابِ مدد کو توفیق دے کہ انکے بچوں کی تعلیم وتربیت کا بلوغ میں

اولڈ بوائز ڈنر

برادرم سید سجاد حیدر صاحب بی۔ اے آنریری سکرٹری اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کی عنایت سے اولڈ بوائز کی سالانہ میٹنگ اور ڈنر کے جو کاغذات ہمارے پاس پہنچے ہیں، اُن سے واضح ہوتا ہے کہ ۲۵ و ۲۶ اکتوبر کو علیگڈھ میں ہمارے قدیم بھائیوں کا مجمع وہاں کی تعطیلات میں ہوا۔ میٹنگ کے پریسیڈنٹ ہمارے برادر محترم شیخ عبداللہ صاحب بی۔ اے۔ ایل ایل۔ بی تھے اور اُن کی عدم موجودگی میں ایک مرتبہ اس فرض کو برادر مکرم سید عبدالباقی صاحب ایم۔ اے نے بھی انجام دیا تھا۔ اس میٹنگ کی تحریکات اور سکرٹری صاحب کی رپورٹ کو اپنے آئندہ نمبر میں درج کرنے کی عزت حاصل کریں گے، البتہ ڈنر کی کیفیت ناظرین اولڈ بوائے کی خدمت میں اب پیش کئے دیتے ہیں۔ ڈنر زیر صدارت سید حبیب اللہ صاحب بیرسٹر کانپور ۲۶ کے بعد کی شب میں ہوا۔ اس موقع پر ایک دوسرے سے ملنے کے لئے اولڈ بوائز کی بیقراری اپنی انتہا پر پہنچ جاتی ہے اور ہمارے پیرانِ نابالغ کی زندہ دلی دیدنی ہوتی ہے۔ خود اپنی ہی لاج میں جو خدا خدا کرکے اب ہمارے قبضہ میں آئی ہے؛ اگرچہ یہ قبضہ تعہد کی قسم کا ہے، شب کے آٹھ بجے مہمانوں کا مجمع ہوا۔ ان کی پزیرائی ہمارے دفتر کے قریب کے چھوٹے ہال میں کی گئی تھی۔ لیکن اس موقع پر میزبان و مہمان دونوں رسمیات سے بری تھے۔ پوری فضا خلوص و محبت، اور برادرانہ رواداری سے معمور تھی۔ اِن آنیوالوں میں سے بعض کی نشست صوفوں پر تھی، بعض کرسیوں پر بیٹھے تھے، بعض نے فرش و قالین ہی پر قناعت فرمائی، اور چند ایسے بھی تھے جنہیں کچھ نہ ملا تو کھڑے رہنے پر صبر کیا۔ کسی نے کسی کا تعارف نہیں کرایا، بلکہ ہال میں داخل ہونے پر ہر شخص کو خود ہی تکلیف کرنی پڑتی۔ کالج میں داخلہ کے وقت سے اب تک کی داستان سنانا اس کے لئے ضروری تھا البتہ بعض سے اُن کے

کالج کے زمانہ کے ناموں کا اظہار اصرار کے ساتھ کرایا جاتا تو بغلیں جھانکتے ہوئے اس کے لئے بھی مجبور ہوجاتے تھے:
دورانِ ملاقات میں سگریٹ اور پان کی تواضع ہوتی رہی۔ سر فلپ ہارٹاگ اور سر جارج انڈرسن ارکان مسلم یونیورسٹی کمیشن، مع اپنے سکرٹری مسٹر ایف رحمان کے ہال میں داخل ہوئے تو سارے مجمع کی صورت ہی دوسری ہوگئی۔ ان سب ثقہ بزرگواروں نے اپنے اِن مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔ کرکٹ لان کی جانب لاج ہی میں ڈنر کا اہتمام کیا گیا تھا۔ تمام مہمانوں کے یکجا ہوجانے پر میزوں کی جانب حرکت شروع ہوئی جہاں خوش ذائقہ کھانے قرینہ سے چنے ہوئے تھے۔ سب سیر ہوکر کھا چکے تو اس موقع کے صدر نشین نے حضور ملک معظم کا جام صحت تجویز کیا، اور نواب سر مزمل اللہ خاں بہادر نے تائید فرمائی۔ حاضرین نے استادہ ہوکر صاف و شیریں پانی سے اسکی تعمیل کی۔ الماٹر کا جام حیات مسٹر محمد یعقوب ڈپٹی پریسیڈنٹ لیجسلیٹو اسمبلی نے تجویز کیا۔ اور نواب صاحب معز نے اسکا جواب دیا۔ اس موقع پر نواب صاحب نے افسوس ظاہر فرمایا کہ یونیورسٹی میں جگہ کی قلت کے باعث سیکڑوں طلبہ کو واپس کرنا پڑتا ہی۔ آپکو اس کا بھی ملال تھا کہ ڈنر کے موقع پر موجودہ طلبہ شرکت کا موقع حاصل نہ کرسکے۔ ہماری ایسوسی ایشن کے سکرٹری نے جواب میں بیان فرمایا کہ ایسوسی ایشن شاہراہ ترقی کی جانب گامزن ہورہی ہی۔ سال آئندہ انشاء اللہ چھوٹے بھائی بھی شریک کئے جائینگے، اور نواب صاحب کی جیب بھی ٹٹولی جائے گی۔
اولڈبوائز کا جام تندرستی تجویز کرنا نواب صدر یار جنگ بہادر کے حصہ میں آیا تھا۔ آپ نے ملک کی عملی زندگی میں اولڈبوائز کے اثر کا ذکر بطور خاص فرمایا۔ مسٹر عبدالعزیز وکیل الہ آباد نے تائید میں اور جناب سکرٹری صاحب نے اس کے شکرانہ میں تقریر کی۔ صدر نشین صاحب نے ارکان مسلم یونیورسٹی کمیشن کی تشریف فرمائی کا شکریہ ادا کیا، اور اس کا جواب سر فلپ ہارٹاگ نے دیا۔ ڈنر ختم ہوا۔ اگلی صبح کو دیکھنے والوں نے دیکھا کہ

داغ فراقِ صحبت شب کی جلی ہوئی — اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

اُولڈ بوائز ڈائرکٹری

علیگڈھ اُولڈ بوائز!

براہ کرم علیگڈھ اُولڈ بوائز ڈائرکٹری (خزینۃ الکرام) میں اپنے حالات درج کرنے کی غرض سے مندرجہ ذیل سوالات کے جواب عنایت فرمائیں۔

(۱) نام مع ولدیت وسکونت۔ مقام وتاریخ پیدائش۔
(۲) تعلیم کی ابتدا کب اور کہاں ہوئی۔ علیگڈھ میں کس جماعت میں داخل ہو کر کہاں تک تعلیم پائی۔ تعلیم کے زمانہ کے خصوصیات وامتیازات (اگر کچھ ہوں)
(۳) علیگڈھ میں تفریحی اشاغل کیا تھے؟ اور ان میں کیا نام پیدا کیا۔
(۴) علیگڈھ میں عملی طور پر کن کاموں میں شرکت کا موقع ملا، مع انکے نتیجہ کے۔
(۵) علیگڈھ سے باہر جا کر کس قسم کی زندگی اختیار کی، اور اس میں کہاں تک کامیابی ہوئی۔
(۶) ملک میں یا بیرون ملک کوئی اہم سفر کیا ہو تو اس کا ذکر۔
(۷) ملک کی علمی، ادبی، یا شعری خدمت انجام دی ہو تو اس کا تذکرہ۔
(۸) شادی کب اور کہاں ہوئی۔ اولاد کی تعداد۔ فرزندوں کے نام۔

نیاز کیش
سید منظر علی

Regd : No, M. 2385

نشان ۵ پہ سرکار آصفیہ

اولڈ بوائے

فہرست مضامین بابت ماہ ۔۔۔ ۱۳۴۵ ف

جلد ۱

صفحہ	مضمون نگار	مضمون	نمبر
۳	جناب مولوی نذیر الدین صاحب ایم اے	ہوا زمین کو کسطرح بچا سکتی ہے	۱
۹	جناب مولوی سید سراج الحسن صاحب ترمذی	ہندوستاں ہمارا (نظم)	۲
۱۰	جناب مولانا شوکت علی صاحب بی اے	شوکت علی "پنشنیا"	۳
۱۳	جناب مولوی سید امین الحسن صاحب ۔۔۔	غزل	۴
۱۴	جناب مولوی شبیر حسین خاں صاحب جوش ملیح آبادی	فریب نظر (نظم)	۵
۱۵	جناب مولوی نصیر الدین صاحب فاروقی	پیام ٹیگور	۶
۱۹	جناب مولوی محمد اصغر صاحب بی اے بیرسٹر	دو العلوم (نظم)	۷
۲۰	جناب مولوی سید محمد ضامن صاحب کنتوری	شرح دیوان غالب پر ایک نظر	۸
۲۵	"سیلانی"	یاد ایام (۲)	۹
۲۸	جناب مولوی سید غلام پنجتن صاحب بی اے ایل ایل بی	" " (۱)	۱۰
۴۰	۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔	ہمارا کالج	۱۱
۴۱	۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔	اولڈ بوائز	۱۲
۴۲	جناب مولانا شوکت علی صاحب بی اے	علیگڈھ کا ایک کھانڈر	۱۳

سید منظر علی اشہر مدیر و ناشر نے ۱۲۰۱۲ سلطان پورہ حیدرآباد دکن سے شائع کیا

قیمت سالانہ ۔۔۔

قطعہ

اے منظرِ گرامی واے اشہرِ جلیل — اُلفت نے تیری دل کو تونگر بنا دیا

بھیجا عجیب نسخۂ جاں بخش و جاں فزا — بیمار کو مسیح کا ہمسر بنا دیا

<<<<<<<<<<<<

لکھ کر کتاب بے بدل منظر الکرام — اہلِ نظر کے واسطے منظر بنا دیا

اربابِ ذی شرف کی سنائی وہ داستاں — کانوں کو رشکِ معدنِ گوہر بنا دیا

کس حسن سے سجائی ہے یہ بزمِ منتخب — جس نے فلک کی بزم کو ششدر بنا دیا

دی مٹنے والی ہستیوں کو عمرِ جاوداں — حرفوں کو آبِ خضر کا ساغر بنا دیا

پھولوں کے ساتھ پتے بھی چن لیے بہار — گلدستہ ایسا باصرہ پرور بنا دیا

<<<<<<<<<<<<

اللہ رے تیرے خامہ کی جادو نگاریاں — اک پر تھا جس کو تو نے کبوتر بنا دیا

ضامن کو دی جگہ فضلا کی قطار میں

ایسے حقیر کو بھی موقر بنا دیا

۲ر جمادی الآخرہ ۱۳۴۴ھ

ضامن کنتوری

دنیا کی آبادی کا سُرعت کیساتھ بڑھنا اور زمین کی قابلیت پیداوار کا دن بدن گھٹنا کیا یہ دونوں باتیں عالمگیر قحط کا باعث ہونگی یا سائنس نئے زرعی طریقوں کے ذریعہ نوعِ انسانی کی مدد کو پہنچے گی۔

انگلستان اور جرمنی کے علماء سائنس کی کانفرنس حال ہی میں منعقد ہوئی تھی جس میں اہم ترین مسئلہ یہ زیر بحث تھا کہ مصنوعی نیٹروجن کسطرح پیدا کیجائے۔ مضمون ذیل میں یہ بتانے کی کوشش کیگئی ہے کہ سر ولیم کروکس نے تیس سال پہلے جو خیالی خواب دیکھا تھا اسکی تعبیر کسطرح ہوئی اور یہ کہ مصنوعی نیٹروجن پیدا کر کے کسطرح دنیا کی موجودہ آبادی سے دگنی آبادی کو خوراک بہم پہنچائی جاسکتی ہے۔ ضرورت ہے تو صرف اس بات کی کہ انسان اس گیس سے پوری طرح فائدہ اٹھائے

ہم جناب مولوی نذیر الدین صاحب کی اس تکلیف فرمائی کے ممنون ہیں۔

اولڈ بوائے

ورلڈ پاپولیشن کانفرنس پر تبصرہ کرتے ہوئے مسٹر جے۔ او۔ پی۔ بلانڈ، جان اسٹورٹ مل کے اس خیال کی پُرزور تائید کرتا ہے کہ قوائے فطرت پر سائنس کی فتحیابی گو کتنے ہی شاندار نتائج پیدا کرے، عام خوشحالی کی ضامن نہیں ہوسکتی؛ بلکہ اسکے ساتھ ساتھ اس بات کی ضرورت ہے کہ شرح پیدائش کو باقاعدہ طور پر گھٹانے کی کوشش کیجائے اور اسپر قابو حاصل کرنے کے تدابیر سوچی جائیں۔ ہمیں فی الحال اس خیال کی صحت یا عدم صحت سے بحث نہیں لیکن بہتر یہ ہوتا کہ سائنس کے موجودہ شاندار کارناموں کا کچھ علم پہلے ہوجاتا۔ ہم زیادہ تر غذائی پیداوار کے مسئلہ پر غور کرینگے۔ اس مسئلہ نے متذکرہ بالا کانفرنس پر بہت کچھ ہیجان پیدا کردیا تھا اور عام خیال یہ تھا کہ مستقبل قریب میں عالمگیر قحط کے حملہ سے چھٹکارا نہیں۔

یہہ پہلی دفعہ ہی نہیں کہ اس قسم کے خطرے کی پیشین گوئی کی گئی ہو۔ تقریباً تیس سال پہلے سر ولیم کروکس نے برٹش ایسوسیشن کو مخاطب کرتے ہوئے یہہ کہکر سنسنی سی پیدا کر دی تھی کہ گیہوں پیدا کرنیوالی زمین کی قابلیت پیداوار دن بدن گھٹ رہی ہے اور اگر وہ سب زمین جو کاشت کیلئے موزوں قرار پا سکتی ہے کام میں لائیجائے تو سال ۱۹۳۱ء کے بعد اتنی پیداوار نہوسکیگی کہ دنیا کی آبادی کے لئے کافی ہوسکے۔

اس زمانہ میں عالمگیر قحط سے بچنے کی کوئی تدبیریں معلوم نہ تھیں اور زمانہ مابعد میں اگر سائنس ایک بہت اہم انکشاف کے ذریعہ بنی نوع انسان کے مدد کو نہ پہنچتی تو ہمارے حشر کا دن معین ہو جاتا۔ اس انکشاف کی نوعیت پر کروکس کی دوربین نظر پڑ چکی تھی چنانچہ اسکے الفاظ ہیں "نیٹروجن کا انجاد (نیٹروجن گیس کو ٹھوس بنانا) ایک اہم ترین انکشاف ہوگا جو علماء کیمیا کی ذہانت و ہوشیاری کا منتظر ہے اور خدانخواستہ مستقبل قریب میں اس کا انکشاف نہوا تو سفید اقوام کا نیست و نابود ہو جانا یقینی ہے"۔

اگرچہ اب نیٹروجن کا انجماد ممکن ہی ہیں یہ نہ مان لینا چاہیے کہ قحط کا خطرہ بھی موجود نہیں۔ ہم صرف یہہ کہہ سکتے ہیں کہ اس قسم کے خطرہ کی مدافعت ہوسکتی ہے۔ آیا یہہ روکا بھی جائیگا یا نہیں؟ بالکلیہ انسان کی عقل اور اسکی کوشش و محنت کی مقدار پر منحصر ہے۔ اس باب میں جو کچھ ہوا اُس کا اجمالی خلاصہ دینے کے پیشتر نیٹروجن کی خاصیت اور اسکی اہمیت بتا دینا مناسب ہوگا۔ نیٹروجن گیس زندگی کی روح ہے لیکن یہ موت کا فرشتہ بھی بن سکتی ہے۔ کرہ ہوائی میں $\frac{4}{5}$ حصہ نیٹروجن کا ہے۔ اس کا اندازہ اسطرح ہوسکتا ہے کہ زمین کی سطح کے ہر مربع میٹر پر کی ہوا میں ۸ ٹن نیٹروجن موجود ہوتی ہے۔ زمین کو زرخیز کرتی ہے اور اسطرح انسانی وجود کا سہارا ہے۔ ہر قسم کے رنگ میں اسکا وجود لازمی ہے اور اسطرح انسانی زندگی کی رنگینی بھی اسی سے قائم ہے لیکن ان قوائے تعمیری کے ساتھ ساتھ ہلاکت کا مادہ بھی اس میں بدرجہ اتم موجود ہے کیونکہ دھماکو اور بھوٹ پڑنے والے مادوں کی بنیاد اسی پر قائم ہے اور اسلئے خود جنگ کی بنیاد بھی۔

کروکس نے جس وقت متذکرہ بالا تقریر کی تھی اس زمانہ میں منجملہ نیٹروجن کے ذخیرے چائل کے قدرتی حوض تھے یا سلفیٹ آف امونیا جو کوئلہ سے اخذ کیا جاتا تھا لیکن اس قسم کے ذخیرے قحط کو روکنے کیلئے ناکافی تھے۔ یہ سچ ہے کہ فطرت خود اپنے میکانیکی طریقوں سے زمین کو نیٹروجن مہیا کرتی ہے لیکن

اسکی رسد بمقابلہ اسکے طلب کے کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ چند پودے (مثلاً کلور گھانس اور لوبیے کی پھلی) ایسے ہیں جن کے جڑوں کے قریب چھوٹے چھوٹے فطرتی کارخانے ہوتے ہیں جن میں محنتی و جفاکش باکٹیریا (جو نہایت خفیف الجثہ جراثیم ہے) ہوائی نیٹروجن کو زمین کیساتھ آمیز کرتا ہے۔ نیز جب کبھی بادل کرہ کتے ہوں بجلی چمکتی ہو تو نیٹروجن گیس کی کچھ مقدار منجمد ہو جاتی ہے کیونکہ شدید برقی بار (Electrical charge) اس کو آکسیجن کے ساتھ مرکب کرتا ہے۔

فطرت کے اس دوسرے طریقہ نے سائنس کی رہبری کی، اور ایجاد و انکشاف کے جذبہ کو تحریک ہوگئی جرمنی نے جب یہہ دیکھا کہ چائل کے خزانوں سے وہ مستفید نہیں ہو سکتا تو اُس نے فوراً اپنی قوت مصنوعی نیٹروجن کو عظیم الشان پیمانہ پر تیار کرنے میں صرف کردی۔ اس صنعت کی ترقی کس سرعت سے ہوئی ہے اس کا اندازہ اس واقعہ کو پیش نظر رکھہ کر لگایا جا سکتا ہے کہ سنہ ۱۹۰۰ء تک کرہ ہوائی سے کچھ بھی نیٹروجن اخذ نہیں کی گئی لیکن صرف سنہ ۱۹۲۵ء میں اسکی محصلہ مقدار ۵۰۰۰۰۰ ٹن تھی۔ آج یہہ حال ہے کہ تمام ممالک متحدہ میں اس صنعت کے کارخانے قائم ہو چکے ہیں۔ اسطرح سر ولیم کروکس کے خواب کی تعبیر صحیح نکلی اور نیٹروجن گیس کا انجماد (جو تقریباً ساٹھہ سال پہلے دار التجربہ میں منجمد کی گئی تھی) اب ایک وسیع تجارتی مہم بن چکا ہے۔

سر ڈانیئل ہال جو اس زمانہ کا بلند پایہ ماہر مزروعات ہے، کہتا ہے کہ سفید اقوام کی آبادی میں سالانہ پچاس لاکھہ کا اضافہ اس بات کا مقتضی ہے کہ ہر سال ایک کروڑ بیس لاکھہ ایکڑ نئی زمین زیر کاشت لائیجائے۔ لیکن جنگ عظمیٰ کے بعد سے یورپی اقوام کا میلان طبع کچھہ اور ہوگیا ہے۔ زیر کاشت زمین میں پھیلاؤ کی جگہ سکیڑ واقع ہو رہی ہے۔ ممکن ہے کہ اس کا نعم البدل تلاش کرلیا جائے لیکن ابتک یہہ بات کسی کے ذہن میں نہیں آئی کہ پھیلاؤ کی گنجایش کہاں ہے۔

ہمارے خیال میں کوئی حل ممکن نہیں سوائے اسکے کہ زیر کاشت زمین کی قوت پیداوار کو تقویت دیجائے، جواب علمی سائنس کی مدد سے ممکن ہے۔ یہاں نیٹروجن کا حصہ عمل اہم ترین ہے۔ فی الحال ہم زمین کی طاقت کو چوس رہے ہیں یعنے ہم زمین سے زیادہ حاصل کرتے ہیں اور اس میں (اسکی زرخیزی کو بڑھانیوالی اشیاء) کم داخل کرتے ہیں۔ بہ الفاظ دیگر، ہم فطرت کے بنک سے قرض پر کام چلا رہے ہیں۔ تو پھر یہ کونسی تعجب کی

بات ہی کہ یہہ بنک جو خدا جانے کس زمانے سے نیا اضافہ قرضے دیتا چلا آرہا ہے۔ دیوالیہ کے قریب پہنچ گیا ہے اور اسکے احسان فراموش بچے مہیب صورت سے پریشان حال ہیں۔

دنیا کے روزافزوں بڑہنے والے منہ کیلئے کافی خوراک مہیا کرنے کا سوال خدا چاہے تو موجودہ نوجوان نسل کی زندگی ہی میں حل کر لیا جائیگا۔ یاد ہو گا کہ کروکس نے سال ۱۹۳۱ء کے بعد قحط پڑنے کا خوف ظاہر کیا تھا، یعنے صرف چار سال بعد۔ لیکن اب ہوا زمین کو بچا سکتی ہے۔ کیونکہ نیٹروجن کی لازوال وسیع کانوں سے نکالنا ممکن ہو گیا ہے، جو کرہ ہوائی میں آزادانہ تیر رہی ہے۔ اس قسم کا عمل جاری ہو چکا ہے، لیکن ترقی کی رفتار آنیوالے خطرہ کی تیز رفتار سے بہت سست ہے۔ پس اسکو بالکلیہ روک نہیں دیا گیا، بلکہ صرف ذرا دور ہٹا دیا گیا ہے۔ اسکی مہیب شکل اب بھی نظر کے سامنے ہے۔ اکثر ماہرین فن کا یہی فتوی ہے۔

حفاظت و سلامتی کے حدود میں داخل ہونے کے لئے مصنوعی نیٹروجن کی پیداوار موجودہ پیداوار سے کم از کم چھہ گنی ہونی چاہئے، تاکہ فی ایکڑ ۲۰ بشل گیہوں ہر سال نکل سکیں، یعنے ۵ لاکھہ ٹن نیٹروجن کی بجائے ہر سال ۳۰ لاکھہ ٹن نیٹروجن تیار ہونی چاہیے۔

ابتک ہم نے صرف یہہ بحث کی کہ موجودہ شرح سے بڑہنے والی آبادی کے لئے خوراک کی قلت کو روکنے کی تدبیریں ممکن ہیں، لیکن ارباب فن کا یہہ خیال ہے کہ اگر سائنس زراعت کی معاون ہو جائے (اور اسکے لئے خاص کر نیٹروجن کی کثیر مقدار کا استعمال لابدی ہے) تو موجودہ آبادی کی دوگنی آبادی کو کافی خوراک مل سکتی ہے۔ کیونکہ جب زمین کو نیٹروجن کی مدد سے زرخیز بنا دیا جائے، تو فی ایکڑ ۳۶ بشل گیہوں اور اس سے زیادہ بھی نکلنے کا امکان ہے۔ دوسری فصلوں کا بھی یہی حال ہوگا۔ مثلاً تجربہ سے یہہ معلوم کیا گیا کہ ایک ٹن نیٹروجن سے آلو کی فصل میں ۱۰۰ ٹن کا اضافہ رونما ہوتا ہے۔

متذکرہ بالا امور سے یہہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر دنیا کی آبادی بہت سرعت سے بھی بڑہنے لگے تو خدانخواستہ فاقہ کشی کی ضرورت پیش نہ آئیگی۔ لیکن ایسا کہنے کے یہہ معنے نہیں کہ قحط وقوع پذیر نہ ہوں گے۔ ہم نے اب تک یہی بتا دیا تھا کہ ہر چیز کا انحصار اسی کوشش و توانائی (Energy) کی مقدار پر منحصر ہے جو ہوا سے نیٹروجن اخذ کرنے اور اس کو زمین کے ساتھ آمیز کرنے میں صرف ہوتی ہے۔ اس باب میں جو سب سے پہلا قدم

سب سے آگے ہے۔ انگلستان بھی ہاتھ پیر مار رہا ہے لیکن منزل مقصود ابھی کوسوں دور ہے۔

سائنس کی روشنی میں ہمیں یہ صاف نظر آرہا ہے کہ خوراک اور آبادی کے پورے مسئلہ نے ایک نئی صورت اختیار کر لی ہے اور ہم ایک ایسے دور کے قریب ہوتے جا رہے ہیں جس میں ہر ملک اپنے باشندوں اور جانوروں کی خوراک خود فراہم کرلیگا اور دوسرے ممالک کی دستگیری کا محتاج نہ ہوگا۔ اسلئے اگر کسی جگہ قحط پڑے تو یہ صرف وہاں کے افراد کی نادانی کا ثبوت ہوگا۔ ہمیں ہرگز یہ فراموش نہ کرنا چاہیے کہ ایام گزشتہ میں بلحاظ آبادی قحط واقع ہوئے ہیں اور آئندہ بھی بلحاظ آبادی واقع ہونگے کیونکہ قحط کا مشترک سبب صرف ایک ہے اور وہ انسان کی بیوقوفی اور نادانی۔

یہ امر بالکل یقینی ہے کہ وہی ملک طاقتور اور مضبوط ہونگے جو نیٹروجن کی صنعت کو ترقی دینگے جو سب سے پہلے وہ قحط کی مہلک زد سے محفوظ و مامون رہ سکیں گے جو ایسے ملک کو ہی اپنا نشانہ بنائیگا، جہاں زمین کو نیٹروجن سے پرورش نہیں کیا جاتا اور اسلئے ایسی زمین کا بانجھ ہو جانا یقینی ہے، جو ایسی موت کے مترادف ہے۔ شاید یہ کہنا مبالغہ ہو کہ نیٹروجن کی صنعت کو ترقی دینے والے ملکوں میں فاقہ کشی کا وجود مسدود ہو جائیگا لیکن ہم بلا خوف تردید اتنا ضرور کہہ سکتے ہیں کہ جب فصل کی افراط ہو تو اسوقت صرف تقسیم کا سوال درپیش ہوگا جس کا حل کرنا کچھ زیادہ مشکل نہیں۔

دن بدن دنیا پر یہ حقیقت کھلتی جا رہی ہے کہ زراعت کی عام پست حالت گھٹیا زمین کی باعث ہے۔ زمین کی یہ خرابی سوئِ غفلت اور زمین کی نوعیت سے عام ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔ زمین بھی زندہ چیز ہے جو ان تمام قوانین کے تابع ہے جو زندگی سے تعلق رکھتے ہیں۔ نباتات اسکی ہر ایک جزو کو بھی شکل و دوسرے رنگ جواہر Atoms کے متقل طور پر [illegible] اور انکو غذا پہنچائی جائے۔ خدا کا شکر ہے کہ نیٹروجن کے ایجاد کا انکشاف بروقت ہو گیا ورنہ یہ ہر سال [illegible] زراعت نزع کی حالت میں سسکیاں لے رہی ہوتی۔ اب کسانوں کی مالی حالت کو ترقی دینا [illegible] کہ وہ زرخیز کرنیوالی اشیاء کو بکثرت خرید سکیں ان لوگوں کا کام ہے جو انکی محنت و مشقت پر پلتے اور انکے سہارے غنی ہیں۔ شہر کا رہنے والا، جسکے سامنے کھانے کی پلیٹ طلسمی طور پر موجود ہوتی ہے۔ [illegible] واقعہ نہیں کر سکتا [illegible]

فاقہ کشی ممکن ہے۔ دیہات اسکی دلچسپی کا مرکز نہیں سوائے اسکے کہ وہ کبھی کبھی شہر کے شور و شغل سے اکتا کر موٹر میں تفریح کرنے نکلے۔

ممالک متحدہ امریکہ میں واقعات کا رنگ کچھ اور ہے جہاں ۹ لاکھ ٹن نیٹروجن کی ضرورت ہے صرف ۴ ۵ لاکھ ۰ ۵ ہزار ٹن نیٹروجن استعمال ہوتی ہے۔ اسطرح ۴۰ فیصدی کی کمی رہجاتی ہے۔ وہاں کے کسان اس سے زیادہ نیٹروجن کے استعمال کے مخالف ہیں صرف اس خود غرضی کی بناء پر کہ کثرت پیداوار سے موثر طلب کا پیدا ہونا ممکن نہیں۔

زمین کے اس ضعف کے باعث خدا جانے کس قسم کا معاشی ہیجان پیدا ہو لیکن اسکی صورت یقیناً مہیب ہو جاتی اگر خدانخواستہ نیٹروجن کے ایجاد کا معجزہ ظہور پذیر نہو جاتا۔

اس مضمون کے دوسرے ہلاکت آفریں رُخ کو اتبک ہم نے بیان نہیں کیا نہ یہاں اسکی گنجایش ہے۔ صرف اختصاراً اسکا اشارہ کرتے ہوئے کہ عقلمند را ایں ہم کافی است جس ملک میں زیادہ سے زیادہ نیٹروجن کے کارخانے ہونگے وہ ملک سب سے زیادہ جنگ کیلئے تیار ہوگا۔ نیٹروجن کی فیکٹری گویا ایک جدید میگزین ہے کیونکہ بہت تھوڑے وقفہ میں اسکو ایسی فیکٹری میں بدلدیا جاسکتا ہے کہ اس سے زہریلی گیسیں اور شدید دھماکہ کی اشیا تیار ہو سکیں اب یہہ ایک کھلی ہوی بات ہے کہ کوئی ملک زمین کو زرخیز کرنیوالی شئے نیٹروجن کی تیاری سے دست بردار نہیں ہوسکتا۔ اسطرح تخفیف اسلحہ کا مسئلہ ایک خوشگوار خواب سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ حقیقی و مادی تخفیف اسلحہ کا شور و غل ایک دھوکہ ہے اور ایک فریب۔ (ترجمہ)

محمد نذیر الدین

ہمیں اطلاع ملی ہے کہ برادرم مولوی حامد علی خانصاحب تحصیلدار کا تبادلہ چنچولی ضلع گلبرگہ سے تحصیل میدک کا ہوگیا ہے۔ دوسرے بھائی بھی اپنی نقل و حرکت کی اطلاع دیتے رہیں تو ہم ممنون ہوں گے۔

ہندوستاں ہمارا!

زیرِنگیں رہا ہے ہندوستاں ہمارا ‏ ‏ ‏ صدیوں رہا ہے اس پر سکہ رواں ہمارا
تھا راحتوں کا مسکن دارالاماں ہمارا ‏ ‏ ‏ اپنا جواب خود تھا یہ گلستاں ہمارا

قسمت چمک اٹھی تھی اس عالمِ کہن کی
روشن جبیں کچھ ایسی تھی مادرِ وطن کی

اس انجمن کا چرچا عالم میں جابجا تھا ‏ ‏ ‏ ہر ذرہ اس زمیں کا سورج بنا ہوا تھا
جس سمت دیکھتے تھے منظر بہار کا تھا ‏ ‏ ‏ دنیا میں بھی یہی اک فردوس پُر فضا تھا

سیراب اسی سے ہوتی عالم کی سرزمیں تھی
چشم و چراغ سب کی یہ خاکِ دلنشیں تھی

ہے روشنی جہاں میں اس شمعِ انجمن کی ‏ ‏ ‏ پھولوں میں تازگی ہے ساری اسی چمن کی
دنیا ابھی ہے ممنوں اس کشورِ کہن کی ‏ ‏ ‏ پر اب کہاں وہ باقی رنگینیاں وطن کی

یورش ہے اب خزاں کی اس کنجِ دلنشیں پر
شاید کہ آسماں اب ٹوٹے گا اس زمیں پر

علم و ہنر کا معدن ہندوستاں کبھی تھا ‏ ‏ ‏ گیتی فروز اپنا نام و نشاں کبھی تھا
سارے جہاں سے دلکش یہ گلستاں کبھی تھا ‏ ‏ ‏ مرغانِ نغمہ خواں کا یہ آشیاں کبھی تھا

گو اب فلک زدہ ہے پر یادِ رفتگاں ہے
دھندلا سا اس فضا میں ماضی کا اک نشاں ہے

ترمذی

شوکت علی پنشنیا "

(ایک سبق آموز لطیفہ)

۱۹۱۲ء میں جبکہ میں مسلم یونیورسٹی کے سلسلہ میں گورنمنٹ کے محکمۂ افیون سے رخصت لیکر اپنے پرانے کالج علی گڈھ کی ذمہ دار کارکنوں کی استدعا پر ہز ہائنس آغا خان کے سکرٹری کی حیثیت سے اُنکے ہمراہ تنہا سارے ہندوستان کا دورہ کر چکا تھا اور خدا کے فضل وکرم سے ہندوستان کے مسلمانوں نے گورنمنٹ کے توقعات کے خلاف ۶ مہینہ کے اندر مطلوبہ سرمایہ مسلم یونیورسٹی کیلئے جمع کر دیا تھا۔ اسوقت میں نے محسوس کیا کہ میرا انگریزی نوکری میں زیادہ رہنا بیکار تھا بلکہ اس سے علٰحدہ ہوکر مسلمانوں کی خدمت کے لئے اپنی باقی ماندہ قوتوں کو وقف کر دوں۔ گورنمنٹ ہند نے اوّل مسلمانوں کو مطلع کیا کہ بیس لاکھ روپیہ جمع کر دیں تو جیسی مسلم یونیورسٹی وہ چاہتے ہیں بنجائیگی۔ سر ہارکوٹ بٹلر جو یوپی کے گورنر رہے پھر برما کے گورنر ہوئے اور آج بھی ریاستوں کی تحقیقات کے لئے مقرر ہوئے ہیں، انھوں نے دہلی کے جلسہ میں مسلمانوں کو مخاطب کرکے اُردو میں تقریر کی تھی اور کہا تھا "روپیہ لاؤ یونیورسٹی لو" جب ۲۰ لاکھ آناً فاناً جمع ہو گئے تو مطالبہ کیا کہ پچیس لاکھ چاہیے۔ جب یہ بھی ہو گئے تو کہا تیس لاکھ لاؤ۔ بالآخر پینتیس لاکھ پر سودا طے ہوا۔ اور مسلمانوں نے یہ رقم بھی جمع کرکے اپنی زندگی کا ثبوت دیا جس سے انگریز بھی چوکنا ہوئے اور انھوں نے خطرہ محسوس کیا کہ جب اس غریب قوم میں اس درجہ احساس موجود تھا تو یہ قوم بہت دنوں تک سوتی ہوئی نہ رہیگی بلکہ اسلام اور اپنے حقوق کیلئے پوری طرح مقابلہ کریگی اس لئے مسلمانوں کے دبانے کے آثار دکھائی دینے اور گورنمنٹ کی پالیسی میں ایک بڑا فرق نمودار ہونے لگا میں نے انگریزی نوکری چھوڑنے کا ارادہ کر لیا۔ مگر میری سترہ (۱۷) سالہ خدمات اسقدر اچھی تھیں کہ مجھ کو

پنشن بھی دیدی گئی۔ اگرچہ میں استعفیٰ دینے کیلئے تیار تھا۔ نوکری چھوڑ کر میں خدام کعبہ اور اولڈ بوائز ایسوسی ایشن علی گڈھ کے کاموں میں مصروف ہوگیا اور ساتھ ہی ساتھ اپنے وطن میں جننگ و پریس اپنی گذر اوقات کیلئے بنوایا۔ اولڈ بوائز لاج میں میں رہتا تھا اور ہر مہینہ کی پہلی تاریخ کو پنشن لینے سڑک کے اس پار کلکٹری کے خزانہ میں جاتا تھا اور افسر خزانہ مجھ کو زندہ پاکر اسی وقت پنشن کا روپیہ دیدیتے تھے۔ میرے دفتر کے کلارک پہلے ہی سے کاغذ بھیجدیتے تھے اور محکمہ کے سب لوگ خاطر کرکے ٹھیک وقت پر بلا لیتے تھے۔ اس زمانہ میں میں انگریزی لباس پہنتا تھا اور اچھا پہنتا تھا۔ ڈاڑھی بھی نہیں تھی جسم بھی بھاری نہیں ہوا تھا۔ کرکیٹ ٹینس اور دیگر ورزشیں بھی جاری تھیں۔

حسب معمول ایک اچھا اسکوتھ اینڈ لارڈ کے یہاں کا سوٹ پہنے ہوئے فلٹ کی ہیٹ سر پر رکھے ہوئے ٹینس بوٹ پہنے ہوئے میں اولڈ بوائز لاج سے سو قدم چل کر کچہری میں اسوقت آیا جس وقت ایک چپراسی جو مجھ کو نہیں جانتا تھا اور جہاں اور پنشن لینے والے بڈھوں کو نام بنام پکار رہا تھا۔ مین میرے پہنچنے کے وقت بلا میری طرف دیکھے ہوئے اُس نے چلا کر آواز لگائی "شوکت علی پنشنیا حاضر ہے"۔ میں قریب تھا چلا کر ہاتھ جوڑ کر کہا "حضور حاضر ہوں"! میری آواز پر چپراسی نے مڑ کر مجھ کو دیکھا اور دیکھکر غریب گھبرایا، ہاتھ جوڑ کر معافی مانگنے لگا کہ اس کو نہیں معلوم تھا کہ میرا یہی نام تھا ورنہ وہ اسطرح بے التفاتی کے ساتھ نہ پکارتا۔ میں ہنستا ہوا افسر خزانہ کے پاس چلا گیا جو میرے کالج کے ہمدرد تھے اور دوست تھے۔ کاغذ پر دستخط کرکے روپیہ لیکر چلا آیا۔

کالج میں بہت سے اولڈ بوائے احباب "شوکت علی پنشنیا" کہکر بعض اوقات مجھے پکارتے تھے۔ میں نے اس چھوٹے واقعہ کو اس لئے اب درج کیا ہے کہ ۱۶ برس پہلے مجھ کو قبل از وقت پنشن ملگئی تھی۔ مگر اب ۱۰ مارچ کو پچپن برس عمر کے پورے ہو جائیں گے، اور وقت آگیا تھا کہ میں پنشنیا بن کر سب کام کو چھوڑ کر اب گھر رہتا، بچوں و عزیزوں میں ہنسی خوشی کی زندگی کاٹ کر آرام سے وقت گذارتا۔ میں نے ایک دوست کے مشورہ سے زندگی کا بیمہ بھی کرایا تھا اور اسی طریقہ سے تھوڑا سا روپیہ جمع کرنے کا طریقہ نکالا تھا۔ چنانچہ اس جنوری میں بیمہ کا روپیہ بھی بیمہ کمپنی نے ادا کردیا اور ساتھ ہی ساتھ مجھکو پچپن سالہ ہونے کی یاد دہانی کی۔ حافظ شیرازی رحمتہ اللہ نے خوب کہا ہے ؎

چوں پیر شدی حافظ از میکدہ بیروں شو
رندی و خراباتی در عہد شباب اولا

پچپن برس معمولی پچپن سال نہ تھے بلکہ گزشتہ ۱۵ برس میں کس صاحب دل مسلمان کو عیش و آرام سے زندگی بسر کرنے کا موقع نصیب ہوا۔ امتحانوں پر امتحان مصائب پر مصائب اسلام و مسلمانوں پر آتے رہے اور اُن سب کے مقابلہ میں بفضلہ تعالیٰ ہم اپنی بساط کے مطابق سینہ سپر ہوئے۔ کم از کم اِن تکالیف کے لحاظ سے جو ہم پر آئیں اس پچپن برس کی عمر میں دس برس کا اور اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ نظر بندی تھی۔ قید بھی تھی۔ کام بھی بہت تھا اپنوں کی طرف سے بُرائیاں بھی ملیں۔ خیر سب وقت کٹ گیا اور خدا کا شکر ہے آج بھی اسلام کا ایک ادنیٰ سپاہی بجائے گھر پر آرام کرنے کے میدان میں کھڑا ہے۔ قدم جب موقع ملتا ہے، آگے بڑھتا ہے پیچھے ہٹنا مسلمانوں کے کسر شان ہے۔ اگر آگے نہیں بڑھ سکتے ہیں تو کمزور پاؤں کو آرام لیکر زمین ہی پر بیٹھ جاتے ہیں۔ اور اسلامی علم کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے دشمنان اسلام کے سامنے اسلامی شان سے اپنی جگہ پر قائم رہتے ہیں۔ (خلافت)

شوکت علی

غزل

کوئی اُمید نہ رکھ اے دل ناداں مجھ سے — غیر ممکن ہے ترے درد کا درماں مجھ سے
ستم یار ہو شکوہ ہو اگر مجھ کو یہ ہے — روٹھ جاتے ہیں سنبھلتے نہیں ارماں مجھ سے
وحشت عشق میں پھر تازہ ہوئی رسم کہن — قیس کے بعد ہیں مانوس بیاباں مجھ سے
حسن پر اور محض حسن پہ قربان رہا — للہ الحمد ہوا کار نمایاں مجھ سے
بر ملا جاتا ہے حسن پرستش اپنی — عشق کو ضد ہے رہے پرسش پنہاں مجھ سے
دست نازک بھی ہے خنجر بھی ہے وہ جوش بھی ہے — اب اٹھائی نہیں اٹھتی ہے یہ احساں مجھ سے

میں نے بتخانہ میں دیکھے ہیں وہ جلوے بسمل
کافری سیکھنے آئیں گے مسلماں مجھ سے

(بسمل)

از جناب مولوی شبیر حسن خاں صاحب جوشؔ ملیح آبادی

زمیں یہ روندی ہوئی پڑی ہے ، جو دل کا غنچہ کھلا رہی تھی
ارے کلی کو یہ ہو گیا کیا ، ابھی تو یہ مسکرا رہی تھی
ورق یہ کیسا الٹ گیا ہے ، خود آج مجروح و بے نوا ہے
وہ جسکی ترچھی نگاہ کل تک ، دلوں پہ نشتر چلا رہی تھی
یہ کیسی کایا پلٹ ہوئی ہے ، چمن میں کیوں خاک اڑا رہی ہے
ابھی تو یاں باد صبح گاہی ، گلوں کو جھولے جھلا رہی تھی
نگاہ اٹھی، تو پھول دیکھا ، پلک جو جھپکی تو خار پایا
سنا کہ فصل گل آ رہی ہے ، چمن میں پہنچے تو جا رہی تھی
بڑھے ہے جھپٹتے ہوئے خوشی میں ، دکھایا لب تشنگی نے دریا
قریب پہنچے، تو ریگ صحرا ، شعاعوں سی جگمگا رہی تھی،
اٹھی جو صحرا میں گرد پیہم ، اٹھے کہ لیلیٰ کی ہے سواری
گئے امیدیں لئے تو دیکھا ، ہوا بگولے اڑا رہی ہے
اڑا جو پردے کا ایک گوشہ ، نظر پڑا اور یہ ان کا جلوہ
جو گھر سے باہر نکل کے دیکھا ، ہوا دریچے ہلا رہی تھی

نظر نے دیکھا کہ شوخ تتلی ، فضا میں پرواز کر رہی ہے
نگہہ جمائی تو خشک پتی ، ہواؤں میں تھرتھرا رہی تھی
اندھیرے جنگل میں آگ دیکھی ، کہ جل رہی ہے کنارِ دریا
بڑھے تو اک نوجوان بیوہ ، سہاگ اپنا بڑھا رہی تھی

تجلیوں کے مشاہدے سے نگاہ اب میری تھک گئی ہے
نظر نے اتنے دیئے ہیں دھوکے بصارت اکتا کے سو گئی ہے

....

اس زمانہ کے بہت تھوڑے شعرا ایسے ہیں جن کے کلام کی جانب ہمیں رغبت ہے۔ برادر محترم معظم [illegible] ضامن کنتوری کے بعد مقامی خوش فکر لوگوں میں ہم جن کے کلام کو پسند کرتے ہیں ان میں سے ایک تو برادر مکرم مولوی شبیر حسن خاں صاحب جوش ہیں، اور دوسرے برادر عزیز مولوی سید سراج الحسن صاحب ترمذی۔ ناظرین اولڈ بوائے بھی ان حضرات کے کلام سے بخوبی واقف ہیں نہ صرف اس لئے کہ جناب جوش ملیح آبادی ایک خوش گو شاعر ہیں بلکہ اس لحاظ سے بھی کہ وہ ایک پرانے اولڈ بوائے دوست ہیں۔ ہمیں [illegible] کے [illegible] ہیں یہ اطلاع پا کر بڑی مسرت ہوئی کہ نظارت دارالترجمہ کے لئے ان کے خدمات کی دو سال تک کیلئے ضرورت محسوس فرما کر ہز اکسلنسی مہاراجہ کشن پرشاد یمین السلطنت بہادر نے توسیع عطا فرمائی ہے۔ مہاراجہ بہادر خود بھی صاحب ذوق سلیم اور ایک بلند پایہ شاعر و ادیب ہیں اسلئے کیا عجب ہے کہ ہز اکسلنسی کے دماغ میں جوش کو کسی مستقل جگہہ پر دیکھنے کی خواہش پوشیدہ ہو۔ اگر ایسا ہی تو پھر بڑی خوشی کے ساتھ اس وقت کا انتظار کرتے رہیں گے۔

اس خبر کے ساتھ ہی ہمیں یہ معلوم کر کے بڑی خوشی ہوئی کہ حضور پر نور اعلیٰ حضرت [illegible] شاہانہ نواب مہدی یار جنگ بہادر [illegible] نواب عماد الملک مرحوم نے [illegible] ماہانہ کا ذاتی الونس جاری فرمایا ہے۔

ٹگور بھگتوں کو صلاح دیتا ہے کہ "بھجن گانا اور مالا جپنا چھوڑ دو۔ مندر کے گوشۂ تنہائی میں پھول اور خوشبو لئے بیٹھے رہنے سے کوئی فائدہ نہیں، اگر حق کی تلاش ہے تو اسے اس کسان کے ساتھ جو زمین پر ہل چلا رہا ہے یا اس جفاکش مزدور کیساتھ جو سڑک بنانے کیلئے پتھر پھوڑ رہا ہے پاؤ گے۔ سچا فدائی اسے اپنی محنت جفاکشی اور عرق ریزی سے پالیتا ہے۔ پس اُسے ہر چیز میں کتنی ہی حقیر کیوں نہ ہو اس ہستی اعظم کا جلوہ نظر آتا ہے اور اسکی ہر وقت یہی دعا رہتی ہے کہ "کل کے تماشہ کی سیر میں اس "ایک" ہستی اعظم کا خیال محو نہ ہونے پائے"۔

"محبت" ٹگور کی تعلیم کا اصل اصول ہے۔ اور "اتحاد" اسکا پیغام ہے۔ اس کا مذہب حقیقی اسکے بربطی نغموں میں نمایاں ہے۔ اسکی محبت بنی نوع انسان، عاجز و خستہ حال افراد کے ساتھ قابل ستائش ہے۔ اس کا دل سمندر کی طرح وسیع اور عمیق ہے۔ ان ہی وجوہات کی بنا پر گیتان جلی انگریزی شاعری میں مذہبی رنگ میں یگانہ ہے۔ گو یہ نغمے دراصل بنگالی زبان میں لکھے گئے تھے لیکن اب وہ انگریزی ادب کا جزو بن گئے ہیں، اور درحقیقت انگریزی زبان کی ترجمانی ہی سے شاعر کو عام مقبولیت حاصل ہوئی۔

اگر ٹگور بنگالی لٹریچر میں ایک ممتاز شخصیت رکھتا ہے تو انگریزی ادب میں بھی اسکا رتبہ کچھ کم نہیں۔ اسکی نثر اور نظم، فسانے اور خطوط، مضامین اور تبصرے انگریزی زبان میں ایک ممتاز حیثیت رکھتی ہیں۔ پس انگریزی ادب کی عالمگیر حیثیت پر نظر کرتے ہوئے ہم گیتان جلی کو ایک بے نظیر کارنامہ کہہ سکتے ہیں

یہ سچ ہے کہ انگلستان کے بعض مشہور شعراء میں مذہبی رنگ پایا جاتا ہے لیکن ہر ایسا کلام جس میں

برلطبی رنگ اس قدرت کیساتھ ادا کیا گیا ہے اور جو بالکلیہ "ہستی اعظم" کی پرستش کے لئے وقف ہو، مغربی رنگ کے بہ نسبت مشرقی رنگ میں رنگا ہوا معلوم ہوتا ہے ۔

ملٹن جو مذہبی شاعری میں سب سے نمایاں شخصیت رکھتا ہے۔ اسکی شاعری ہی زیادہ تر خارجی ہے۔ توضیح اور بیان بہت زیادہ ہے لیکن نغمہ آسا رنگ بہت کم ہے! انگلستان کا بلند پایہ شاعر ولیم شکسپیر ڈرامائی ادب میں فرد واحد کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ حیات انسانی کے رموز سے کما حقہ آگاہ ہے اور دلی کیفیات اور حیات کی تہہ تک اسکی نظر پہونچی ہوئی ہے۔ اس کے کلام میں حیات انسانی کا ہر رُخ پیش نظر ہے مسئلہ محبت والفت اور اسکی تمام دقتیں اور کاوشیں نہایت ہی خوبی کے ساتھ نظم میں بیان کی گئی ہیں! اس نے نہایت حسن وخوبی کے ساتھ جوانی کی امنگ اور بڑھاپے کی پژمردگی کو منعکس کیا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ اسکے بیان میں بھی ہندی شاعر کا گہرا صوفیانہ رنگ مفقود ہے! انسان کے متعلق اس نے بہت کچھ لکھا ہے لیکن مسئلہ وجود باری مفقود ہے۔

ہم تسلیم کرتے ہیں کہ شکسپیر کا کلام تفریح کا معقول سرمایہ ہے۔ ہم باور کرتے ہیں کہ اسکے بہادروں نے بادِ مخالفت کا نہایت دلیری کیساتھ مقابلہ کیا ہے۔ ہم خوب جانتے ہیں کہ اسکے بعض سورماؤں نے یہ جان لیا کہ یہ تمام جلوہ ظاہری (نمائش عالم) ایک دن نیست ونابود ہو جائیگا لیکن اسکے کسی سورما کو ان مسائل کا سامنا نہ کرنا پڑا جو ہمیں گیتان جلی میں ملتے ہیں۔ وہ عقیدت اور عبودیت کی پاک اور خالص نظم ہے۔ اس میں خارجی عنصر کا شائبہ تک نہیں۔ انسان کو خدا سے برحق کی لو روح کی "روحِ اعلیٰ" میں سما جانے کی خواہش وبیقراری، امید ویاس، حالت رنج وراحت یہ سب اس نظم کا موضوع ہیں۔ یہ دراصل ہندی تصوف کی انگریزی زبانیں ترجمانی ہے۔ یا مغرب سے مشرق کا تعارف۔

باغبان میں جو برلطبی نغموں کا مجموعہ ہے شاعر یہی پیغام دیتا ہے وہ بنی نوع انسان کو صلاح دیتا ہے۔

"بہت یقین کرو گو اسکے لئے رنج کا سامنا ہی کیوں نکرنا پڑے۔ اپنے دل کو کڑا ہونے مت دو"

فلسفیوں کا یہ خاص مقولہ ہے کہ دنیا چونکہ خالی ہے اسلئے محبت اور راز دنیا کے معاملوں پر نظر غائر ڈالنا فضول ہے۔ دنبدرناتھ محسوس کرتا ہے کہ حیات کی مثال کنول پر شبنم کے قطرہ کی سی ہے لیکن

اسکے نزدیک محبت کی غرض و غایت یہ ہے کہ انسان کی قلیل المیعاد زندگی کو خوشگوار بنایا جائے۔ وہ التجا کرتا ہے:

”تیا۔ زندگی کو فضول نہ جانئے ہم دونوں ہی چند لمحوں کیلئے غیر فانی رہ چکے ہیں۔
زندگی سورج کے ساتھ ڈھلتی ہے۔ ہماری زندگی تھوڑی ہے۔۔۔۔۔ اس میں محبت کے
صرف چند لمحے میسر آتے ہیں“۔

اس کا تخیل ”محبت“ روحانی ہے نہ کہ مادی۔ ”لاتناہی“ کی خواہش ہی اسلئے وہ بالاتر ہے۔ وہ کہتا ہے۔

”میں وہ چاہتا ہوں جو مجھے ملتا نہیں اور وہ ملتا ہے جو مجھے درکار نہیں“۔

وہ محبت یہی ہے جسکی جبیں پر خدائی کا راز منکشف ہے اس نظم میں وہ جذبہ شوق سے بے اختیار ہو کر پکار اُٹھتا ہے۔

میں بیقرار ہوں۔۔۔۔۔ میں بعید ترین چیزوں کا طالب ہوں۔
اے عظیم الشان! اے کہ تجھ تک رسائی عقل ناممکن ہے۔۔۔۔۔ میں بھولتا ہوں۔
میں ہمیشہ بھولتا ہوں کہ میرے پاس طاقت پرواز نہیں کہ اُڑ سکوں۔۔۔۔۔ میں اس
جگہ مقید کر دیا گیا ہوں“۔

پس یہ وجہ کمال تک پہونچنے کی خواہش اور روح اعلیٰ سے ملجانے کی تمنا ہے جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں ”محبت“ دنیا کی مقبول شاعری کیطرح ٹگور کی شاعری کی بھی اصل اور روح رواں ہے۔ انگلستان کے ایک مشہور پیغام بر نے سچ کہا ہے کہ شاعری بغیر محبت کے ناممکن اور بعید از قیاس ہے۔

ٹگور کا ادب پر ایک دوسرا احسان اسکی وہ شاعری ہے جس میں اُس نے عالم طفولیت پر خامہ فرسائی کی ہے۔ بہتوں کو تعجب ہوگا کہ ایک ننھا سا بچہ کسطرح شاعرانہ مسرت اور علائے تخیل کا باعث ہو سکتا ہے۔ لیکن اسی ننھے بچے کی زندگی کے مطالعہ سے فلسفیوں نے کلام میں تاثیر پیدا کر لی۔

انگریزی شاعری میں بلیک اور ورڈسورتھ سے پہلے بمشکل کوئی ایسی نظم ملے گی جس پر عہد طفولیت کا کما حقہٗ اطلاق ہو سکے۔ عالم طفلی کی جانب اشارات تو جابجا پائے جاتے ہیں لیکن معصوم کا شاعرانہ نقطہ نظر سے غائر مطالعہ اور اسکی زندگی کا ماضی اور مستقبل سے تعلق پیدا کرنا انگریزی ادب میں ایک جدید

اضافہ ہے۔ ورڈسورتھ کے زمانے اور اسکے بعد کے عہد نے شاعر کے مطمح نظر پر بہت گہرا اثر کیا، اور وہ زندگی کا اور ہی نقطہ نظر سے مطالعہ کرنے لگا۔

ورڈسورتھ کی نظم (Ode on Immortality) اس قسم کی بہترین نظم ہے جو اب تک انگلستان میں لکھی گئی۔ "معصوم" ٹیگور کے "لال" کا ہیرو ہے۔ اسکی زندگی کی طرف گیتان جلی میں بھی اشارات ہیں اور وہ چھوٹے قصوں میں بھی، ایک نمایاں حصہ لیتا ہے۔ ٹیگور کے نزدیک معصوم ایک مومنی ہستی ہے۔ اگر کوئی اس کو برا کہے تو وہ برافروختہ ہوکر پوچھتا ہے۔

"کیا تم اہ کال کو اسلئے کالا کہتے ہو کہ اسنے اپنے چہرہ پر سیاہی پھینک لی ہے گندہ کہو گے۔"

وہ دنیا جس میں معصوم رہنا چاہتا ہے وہ عالم فطرت ہے اور جس غذا پر وہ جیتا ہے وہ تخیل ہے۔ چھوٹے بچے سڑک کی قندیلوں اور آسمان کے چمکتے تاروں میں کوئی امتیاز نہیں کرتے۔ ٹیگور کا "ننھا سورما" اس عالم کی سیر کرنا چاہتا ہے جسکی نسبت کسی کو کچھ نہیں معلوم۔ وہ چاہتا ہے کہ سات سمندر پار کی سیر کر کے آئے۔ اس عالم میں سروری جہاں عقل و شعور کا پتہ نہو۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسے انسانوں کے علاوہ دوسری طاقتوں سے بھی کچھ تعلق ہے۔

"دریا کی شریر پریوں کی آوازیں گویا اسکو اپنے گنہگار خانہ کی طرف بلاتی ہیں"۔

جان لینے والی موجیں؛ جو ہمارے لئے باعث وحشت ہیں چھوٹے بچوں کو اسطرح بے معنی لوریاں دیتی ہیں، جیسے ماں جھولا جھلاتے وقت۔ شاعر کے نزدیک "معصوم" محبت کا مرادف ہے وہ اپنی ماں کیلئے آرام جان اور لخت جگر ہے۔ "لال" میں "معصوم" ماں سے اپنی پیدائش کے متعلق پوچھتا ہے جنکے جواب میں وہ کہتی ہے۔

تو میرے دل میں خواہش بنکر چھپا ہوا تھا۔۔۔۔۔۔۔ میرے بچپن کے کھیلوں میں تو میرا کھلونا تھا ۔۔۔۔۔ غیر فانی روحوں کے عالم میں تو وقت کے کھر میں پھرتا ہوا میرے ہاتھ لگا۔

جب میں تیرے چہرہ کو دیکھتی ہوں سب راز سربستہ افشا ہو جاتا ہے۔ تو جو سب کی ملکیت ہے میرا ہو گیا۔ اس ڈر سے کہ تو کھو نہ جائے میں تجھے اپنے سینے سے لگائے رکھتی ہوں۔ کس طلسم نے کائنات کی بہترین نعمت مجھے سونپ دی ہے!

یہ عالم طفولیت کا ایک نرالا تصور رخانہ خیال ہے۔ شاعر کے نزدیک "معصوم" کا پیام محبت ہے وہ عالم انسانی کو نصیحت کرتا ہے کہ "معصوم" کی زندگی سے متاثر ہوں۔ یہ وہی خیال ہے جس کو دنیا کے ایک برت پیغمبر نے اسطرح ادا کیا ہے۔

"اگر تم معصوم ہو گے تو بہشت میں داخل ہو سکو گے۔"

عالم طفولیت کی شاعری ہند کی شاعری کا ایک خاص شعبہ ہے۔ زمانہ قدیم سے ہندوستان کی شاعری کا مبحث ننھے بچے کی زندگی کا مطالعہ رہا ہے۔ ہندوؤں کے مذہبی قصوں میں سری کرشن جی کو بچے کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے اور انکے طفلانہ رجحانات پر مختلف رنگ آمیزیاں کی گئی ہیں۔ (باقی)

افضل حسین فاروقی

دوا معلوم!

وہ کریں گے علاج کیا معلوم　درد معلوم ہی دوا معلوم
سُن کے افسانۂ محبت کو　کیوں وہ بُت بن گئے، خدا معلوم
کوئی ہوتی ہے فرطِ اُلفت میں　بیوفائی بھی بے وفا معلوم
ہم نے کاٹی جنوں میں ساری عمر　ہوا کچھ بُرا بھلا معلوم
میرے کمبخت دردِ دل کی بھی　ہے کوئی آپ کو دوا معلوم
رہتے ہیں شوق سے مرے دلمیں　اُن کو ہے خانۂ خدا معلوم
مغفرت کی دُعا بلند ہوئی　لبِ مینا کی ہے صدا معلوم
کوئی آیا نہ کام مشکل میں　ہو گئے یار آشنا معلوم
زندگی کاٹے کوئی کٹتی ہے　حال اپنا کسی کو کیا معلوم

پوچھئے آپ کچھ نہ اصغر سے
ہو گیا راز ہو گیا معلوم

(اصغر)

شرح دیوان غالب پر ایک نظر

(۲۲)

لے گئے خاک میں ہم داغ تمنائے نشاط
تو ہو اور آپ بہ صد رنگ گلستاں ہونا

ماحصل شرح یہ ہے "ہم داغ لے کے چلے اب تجھی باغ باغ ہونا مبارک ہو" اور اعتراض ہے کہ "گلستاں ہونا باغ باغ ہونے کی جگہ محاورے میں تصرف ہے"۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ زہت باغ حسن سے فروغ حسن کیوں نہ مراد لیں اور شعر کے معنے یوں کریں کہ "ہم تو داغ تمنا لے کر چلے اب تم اپنے حسن کو بصد رنگ چمکاتے پھر!" اور اس کہنے کا منشا ہو طنز کرنا جیسے خواجہ وزیر کہتے ہیں سے "اسی باعث تو قتل عاشقاں سے منع کرتے تھے + اکیلے پھر رہے ہو یوسف بے کارواں ہو کر"۔ اسکے بعد محاورے میں تصرف کا اعتراض اٹھ جاتا ہے اور کیا عجب ہے کہ شاعر کا یہی منشا ہو۔

(۲۳)

شب خمار شوق ساقی رستخیز اندازہ تھا
تا محیط بادہ صورت خانۂ خمیازہ تھا

شرح "رات کو میرے شوق نے قیامت برپا کر رکھی تھی" شارح نے رستخیز اندازہ کے معنے رستخیز انداز کے لئے ہیں جس سے طالب لفظی مغالطے میں پڑ سکتا ہے۔ کہہ سکتے ہیں کہ "خمار شوق بہ اندازہ رستخیز تھا" مگر اس سے معنوں میں کوئی اختلال نہیں پیدا ہوتا۔ آگے فرماتے ہیں "اور شوق میں بے لطفی و بے مزگی جو تھی اسوجہ سے اُسے خمار سے تشبیہ دی اور کہتا ہے یہاں سے لیکر دریائے بادہ تک میرے خمیازہ کا صورت خانہ بنا ہوا تھا" یہ

درحقیقت شارح نے نظم کی نثر بنائی ہے مگر شوق میں بے مزگی و بے ربطی کا ہونا بے ربط سی بات ہے۔ شوق کے لغوی معنے آرزومندی کے ہیں اور اردو میں اس محل پر زیادہ تر اشتیاق کہتے ہیں خمار شوق ساقی سے مُراد میرے خیال میں ساقی کی یاد بحالت خمار ہے۔ صاف لفظوں میں اسطرح شرح کی جاسکتی تھی۔ "ساقی کے اشتیاق (زیادہ) کی جھانجھ (خمار) بہ قدر قیامت تھی (قیامت کا نمونہ تھی)۔۔۔ اس حالتِ (خمار) میں یہ جو انگڑائیاں لیتا تھا (انکی لہریں) محیط مادہ (میخانہ) تک پہونچتی تھیں"۔ اسکے بعد شارح نے جو شعر کا حاصل مطلب تحریر فرمایا ہے وہ بالکل درست ہے یعنے "غرض مصرع کی یہ ہے کہ انگڑائی لینے میں جو ہاتھ پاؤں پھیلتے تھے وہ گویا شراب کو ڈھونڈھتے تھے"۔

یہ تو شعر کے ظاہری معنے ہیں جو مولانا مدظلہ نے بیان فرمائے۔ ہمنے جو اس شرح کے متعلق لفظی اختلاف کیا ہے وہ محض لفظی ہے مگر یہ شعر اشعار بلیغہ میں سے ہے۔ بلاغت کی تعریف یہی ہے کہ کوئی بیان اپنے سطحی معنوں کے علاوہ دوسرے عمیق معنے بھی رکھتا ہو۔ اسلئے اب اس شرح کو بھی ملاحظہ فرمائیے جو مجدد میرٹھی نے فرمائی ہے۔ لکھتے ہیں :۔ "شب جو رندوں کے سر میں ساقی کے آنے کا خمار شوق بھرا ہوا تھا تو اس میں اندازہ رستخیز تھا یعنے غل اور چیخ پکار کہ ساقی آئے اور شراب پلادے۔ ایسی حالت میں شراب خواہ جام میں تھی یا صراحی میں یا مینا میں یا خم میں یا حوض ترسا میں اسکے محیط یعنے اوپر کے خط میں (جہانتک شراب بھری رہتی ہے) خمیازہ کا عالم تھا، کیونکہ خط میں بہ اعتبار تمد د خمیازہ کی شکل ہوتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ شراب خانہ کی ہر شے یہانتک کہ خود شراب بھی خمیازہ کش تھی کہ جبتک ساقی نہ آئے اس میں بھی کیف پیدا نہیں ہوسکتا۔ صورت خمیازہ نہیں کہا بلکہ صورت خانہ خمیازہ کہا ہے یعنے ساقی کے شوق میں تمام شراب خانہ خمیازۂ طلب کا ایک صورت خانہ بنا ہوا ہے"۔ اس موقعہ پر ایک نکتہ عرض کردینا ضروری ہے۔ شاعر جب شعر موزوں کرتا ہے تو پہلے اسکی نظر اتنی گہری نہیں جاتی، وہ کسی واقعہ یا احساس یا تخیل سادہ کی بنا پر بسا اوقات ایک ہی مصرع موزوں کرتا ہے۔ بعد ازاں اسی کی مناسبت سے تکمیل یا توضیح کلام کیلئے اسپر دوسرا مصرع بہم پہنچاتا ہے۔ یہ اتفاقی امر ہوتا ہے کہ پہلی ہی تلاش میں بلاغت کا پہلو پیدا ہوجائے ورنہ فکر اوّل میں محض سامنے کا مضمون نظم کرتا ہے پھر نظر ثانی میں اگر شاعر معمولی درجہ کا شاعر ہے تو اسکی سعی صرف بندش الفاظ کی اصلاح تک محدود رہتی ہے لیکن اگر وہ جید شاعر ہے تو الفاظ کے ردوبدل اور بندش کے الٹ پھیر سے صوری و معنوی تکلفات پیدا کرنے کی

کوشش کرتا ہے جس سے شعر میں بلاغت پیدا ہوتی ہے۔ مرزا غالب کا یہ شعر اسی نوعیت کا ہے۔ اور شاعر کا پہلا خیال وہی پایا جاتا ہے جو علامہ طباطبائی نے بیان کیا ہے۔ دوسرے معنے ممکن ہے کہ شاعر نے خود پہلے فکر کے الفاظ میں رد و بدل کرکے داخل کئے ہوں یا ممکن ہے کہ شعر پہلی ہی فکر میں بصورت کذا ہی نظم ہو گیا ہو اور شارح کی نظر متجسس نے اس میں ان معانی بعیدہ کا پتہ لگا لیا ہو۔

(۲۴)

مانع وحشت خرامی ہائے لیلیٰ کون ہے

خانۂ مجنونِ صحرا گرد۔ بے دروازہ تھا

شرح فرمائی ہے "مجنوں کا گھر تو صحرا ہے اور صحرا وہ گھر ہے جس میں دروازہ نہیں۔ پھر کیوں نہیں وحشی ہو کر اسکے پاس چلی آتی کون اُسے مانع ہے"۔ یہ شرح بعینہٖ نظم کی نثر ہے اور بظاہر اس میں کوئی اُلجھن نہیں نظر آتی۔ مگر پھر بھی متن و شرح نظر غائر چاہتے ہیں۔ غور سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ مصرعۂ اولیٰ میں فعل بزمانہ حال ہے اور مصرعہ ثانی میں بزمانۂ ماضی اور ازمنۂ فعل کے اختلاف نے بیان میں ناگوار بے ربطی پیدا کر دی ہے

اسی مضمون کو ناصر علی سرہندی فرماتے ہیں ؎

امتیاز شہر و صحرا داشت از نقص جنوں ورنہ مجنوں را خرابی ہائے خود ویرانہ بود

شاید ناصر علی ہی کے شعر سے غالب کے شعر کو ماخوذ خیال کرکے حضرت شوکت میرٹھی نے وحشت خرامی ہائے لیلیٰ کو وحشت خرابی ہائے لیلیٰ بنایا ہے اور شرح یوں فرمائی ہے "مجنوں کو خیال ہے کہ خدا جانے لیلیٰ میرے گھر کس وقت آ کھڑی ہو پس وہ انتظار میں گھر سے باہر نہیں نکلتا، ورنہ وہ غریب تو صحرا اندر ہے اور اس کا گھر بے دروازہ ہے پس اے خرابی ہائے لیلیٰ بجز تمھارے مجنوں کی وحشت کا مانع نہیں، یہ دقتیں تمھاری ہی ڈالی ہوئی ہیں"۔ اس شرح کی نسبت بجز اسکے کیا کہا جائے کہ جو مطلب آپ سمجھے ہیں خدا کرے کوئی اور یہ مطلب نہ سمجھے۔

(۲۵)

پوچھ مت رسوائی انداز استغنائے حسن دست مرہونِ حنا، رخسار رہن غازہ تھا

شرح ہے کہ "حسن کو باوجود استغنا ایسی احتیاج ہے کہ ہاتھ حنا کی طرف اور مُنہ غازہ کی طرف پھیلائے ہوئے ہے" لیکن میں پوچھتا ہوں کہ اگر یہی مطلب ہے تو کیا کسی کی طرف ہاتھ پھیلانا اور مُنہ پسارنا ہی شان استغنا ہے؟ اگر واقعی حُسن مستغنی تھا تو اس کو مرہُون حنا اور رہن غازہ ہونے کی حاجت ہی کیا تھی؟ یہ اجتماع نقیضین کیا معنے رکھتا ہے کہ محتاج بھی ہے اور مستغنی بھی؟ پھر اوپر سے طرہ تفاخر انداز استغنا کی رسوائی ہا میری سمجھ میں تو کچھ بھی نہیں آتا حالانکہ شارح نے باوجود کا لفظ اپنی طرف سے بڑھا دیا ہے البتہ اگر بجائے انداز استغنا کے ادعائے استغنا ہوتا، تو معنے ٹھیک بیٹھتے، اسلئے کہ ادعا جھوٹے دعوے کو کہتے ہیں اور غالباً یہی مدعاے شاعر ہوگا لیکن وزن شعر کی تنگی سے لفظ ادعا نہ آسکا، فتدبر۔

(۲۶)

نالۂ دل نے دئے اوراق لختِ دل بباد

یادگارِ نالہ اک دیوان بے شیرازہ تھا

شارح علامہ تحریر فرماتے ہیں کہ "باد دادن فارسی کا محاورہ ہے اردو میں برباد کرنا کہتے ہیں۔ یہ اعتراض بالکل درست ہے لیکن غالب نے فارسی کا بباد دادن کہا ہے اردو کا برباد کرنا نہیں کہا ہے اسلئے بباد کرنا بھی اردو محاورہ نہیں ہے" لیکن اصل اعتراض جو اس شعر پر وارد ہوتا ہے اور جس میں علامہ مظلہ نے معنے پنہائے ہیں۔ وہ یہ ہے کہ "جبکہ اوراق لختِ دل کا دیوان بے شیرازہ نالہ کی یادگار تھا تو خود نالہ نے اس کو کسطرح برباد کر دیا؟ یہ ایک معما ہے جو سمجھ میں نہیں آتا۔ شارح کا نالہ کو شاعر اور اوراق لخت دل کو اس کا دیوان کہنا کسقدر ناموزوں تاویل ہے اسلئے کہ جب نالہ کو اسی شعر میں ہوائے تند یعنی کسی شے کو اڑا دینے والی ہوا فرض کر لیا ہے تو پھر وہی باد تند ایک وقت میں اوراق لخت دل کی جامع وحدوں کسطرح قرار پا سکتی ہے۔ البتہ ممکن ہے کہ غالب نے دوسرے مصرعہ میں یادگار عشق کہا ہو اور کاتب نے اسپر اصلاح دیکر نالہ بنا دیا ہو۔

نوٹ اس مضمون کے لکھنے کے کچھ دنوں بعد مجھے دیوان غالب کا جدید نسخہ حمیدیہ دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اس میں اس شعر کا قبل نظر ثانی مصنف اسطرح ہونا بتایا گیا ہے ؎

دیدۂ تر نے دئیے اوراق لخت دل بہ آب — یادگار نالہ اک دیوان بے شیرازہ تھا

اگر یہ شعر اسی حالت سے رہتا تو اسکے باسعنے ہونے میں کوئی کلام نہ ہوتا لیکن نظر ثانی میں سہو نے پہلے مصرعہ کی اصلاح کرکے اس صورت میں کر دیا جسطرح اب متعارف نسخۂ دیوان غالب میں پایا جاتا ہے یعنے ع نالۂ دل نے دسے اوراق لخت دل بباد الخ۔ آپ کہیں گے کہ غالب نے ایسا کیوں کیا؟ اسکی وجہ مجھ سے سنئے۔ جسطرح مولانا طباطبائی فرماتے ہیں کہ "بباد دینا اردو کا محاورہ نہیں بلکہ برباد کرنا ہے"۔ اسیطرح فارسی گو غالب کو نظر ثانی کے وقت محسوس ہوا ہوگا کہ "اوراق برآب دادن فارسی کا محاورہ نہیں ہے بلکہ بہ آب انداختن ہے"۔ مصرعہ میں انداختن کی گنجایش نہ تھی شاعر نے محاورے کی غلطی دور کرنے کو پورا مصرعہ بدل کر یوں کر دیا ع نالۂ دل نے دیئے اوراق لختِ دل بہ باد۔ اب یہ مصرع تو درست ہوگیا لیکن دوسرے مصرعہ سے نالہ کا لفظ نکال دینے کا خیال نہ آیا اور وہ جوں کا توں باقی رہگیا۔ محاورے کی اصلاح میں معانی کی حجامت بن گئی گر کیا اس سے غالب کے کمال پر کوئی حرف آتا ہے۔ نہیں یہ محض سہو نظر ہے اور بشریت کا مقتضا۔

(۲۷)

ہے اب اس معمورہ میں قحط غم الفت اسدؔ ہمنے یہ مانا کہ دلی میں رہیں کھائیں گے کیا

شرح "ہمیں تو غم کھانے کا مزہ پڑا ہوا ہے اور وہی یہاں نہیں یعنے اس شہر میں ایسے معشوق نہیں جن سے محبت کیجئے"۔ بظاہر الفاظ شعر کے یہی معنے ہیں، لیکن درِ اصل مقصود شاعر اپنے شہر کی تباہی کا ذکر کرنا ہے اور قحط غم الفت کا ذکر محض بیان شاعرانہ ہے۔ اور یہ شعر غالب حدیث سعدی ہے" ؎

چناں قحط افتادہ اندر دمشق کہ یاراں فراموش کردند عشق

لیکن سچ یہ ہے کہ غالب کا شعر سعدی کے شعر کو نہیں پہنچتا۔ سعدی کے پاس چناں کا لفظ حقیقت کا ایسا نقشہ کھینچ رہا ہے کہ باید وشاید پھر یاروں کے ساتھ۔ کہتا ہے کہ دمشق میں ایسا قحط پڑا کہ اور تو اور عشق باز عشق کرنا بھول گئے۔

ضامن کنتوری

یادِ ایام

(۲)

میں فسٹ ایر میں داخل ہوا اور ایک سال تک اگرچہ بہت پڑھنے والا تھا کبھی کتاب کو ہاتھ نہ لگایا۔ سارا کالج میرا دوست بنا۔ سب سے صاحب سلامت تھی۔ سب کی عادت سے کم و بیش شناسائی تھی۔ پڑھنا لکھنا کا۔ اب نئی اُمنگوں نے سر نکالا تھا، نئے ولولے تھے، نئی دنیا میں داخل ہو رہا تھا۔ ادھر شوکت صاحب ہر دم اس خیال میں لگے رہتے تھے کہ مجھے اپنے ہم رنگ بنالیں۔ وہ ہر دم تاک میں تھے۔ جمعہ کے دن کرکٹ تھا شوکت صاحب فٹ بال فیلڈ کے باہر کھڑے تماشہ دیکھ رہے تھے۔ جناب مارسین صاحب و مسٹر ارنلڈ صاحب بھی کھیل میں شریک تھے۔ جناب مارسین صاحب شروع سے ایک پدرانہ شفقت سے مجھ پر عنایت فرما اور میرے حال و مستقبل کے نگراں تھے۔ کھیل میں اتفاقاً مارسین صاحب کا مقابلہ ہو گیا۔ ایک منٹ میں انھوں نے مجھے زمین پر چت گرا دیا۔ میں روزمرہ کے لباس میں پاجامہ پہنے کھیل رہا تھا۔ گرنا بلا ہو گیا۔ شوکت صاحب اُچھلے کودے، تالی بجانی شروع کر دی، اور شور مچانے لگے کہ "کابلی پاجامہ گر گیا"۔ انھوں نے جلد ہی اسکو کھینچ تان راگ کی صورت میں موزوں بنا کر ٹرک پر بجی اور اکچی بارک میں، ڈائنگ حال میں، غرض کہ سب جگہ جہاں مجھ کو دیکھتے یہی الاپنا شروع کر دیا کہ "کابلی پاجامہ گر گیا"۔ میری یہ ضد کہ انگریزی لباس اور نیکر نہیں پہنیں گے، ادھر شوکت صاحب کی ضد کہ پہنا کر چھوڑیں گے۔ ادھر نئے ولولے، لیکن اپنی جسمانی کمزوریاں محسوس کر کے میدان تنگ پاتا تھا، غرضکہ کھیل وغیرہ کا جو تھوڑا سا شغل تھا وہ بھی جاتا رہا۔

چند روز بعد کالج میں کھیل شروع ہوئے۔ سید عبدالحفیظ، محمد زماں خاں (ای۔ اے۔ سی سیالکوٹ)

حاجی محمد خاں (ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس) لارڈ حامد صاحب وغیرہ کی بن آئی تھی۔ انکی ہر دلعزیزی انکی آزادی دیکھ کر میرا دل للچا گیا کہ میں ایسا مضبوط اور آزاد کیوں نہیں؟ سوال پیش ہوا کہ کیونکر بن سکوں؟ دیوانگی کے پھندے میں آگیا۔ بیچارگی کا سماں تھا۔ کچھ بن نہ آتی تھی۔ اسی خیال سے سب سے الگ رہنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ پڑھائی بھی چھوٹ گئی۔ امتحان میں ناکام ہو گیا۔ ہر جگہ کی بیقدری سے عاجز تھا۔ نہ مانیٹر پوچھتے نہ کھلاڑی مجھ سے بات کرتے۔ ہر جگہ حقیر تھا۔ میری کوئی شخصیت نہ تھی۔ میری حالت روز بروز ابتر ہونے لگی۔ غذا بھی کم ہو گئی۔ راتوں قلعہ کے ویرانہ میں جا کر قبرستان میں بیٹھا رہتا، یا اسکی فصیل پر آدھی رات تنہا جا بیٹھتا یا اسکے تاریک کنوے کے پاس بیٹھا ہوتا۔ دیوانگی کا نقشہ جم گیا لیکن مقاصد حاصل نہ ہوا۔

مولوی عباس حسین صاحب پروفیسر فارسی میرے حال پر اکثر مہربان رہے۔ انکے پاس معالجہ کی غرض سے گیا۔ دسمبر کے ایام میں رات کے ٹھنڈے پانی سے صبح کو نہاتا لیکن دیوانگی روزافزوں تھی، یہاں تک کہ مسٹر ایس کو میری حالت دیکھ کر خیال پیدا ہوا اور انھوں نے ڈاکٹر رابرٹ میڈیکل افسر کالج کو میری بابت لکھا۔ ڈاکٹر صاحب نے مرض ہائپوکانڈریا بتایا۔ اب ڈاکٹر شفاعت اللہ صاحب اور نعیم الدین خاں کے حوالے ہو گیا۔ ڈاکٹر شفاعت اللہ صاحب کی دوستی میں اچھا کھانا ملنے کی امید ہو گئی، وہ ہر روز نئی غذا کبھی کباب اور پلاؤ، کبھی زردہ اور بھونا وغیرہ لکھدیتے۔ منشی اطاعت کرتا۔ کھانا تو بہت اچھا ملنا شروع ہوا لیکن مہینے کے آخر میں بل دیکھ کر حواس جاتے رہے۔ آخرش ڈاکٹر صاحب کی عنایات سے دست بردار ہو کر دلئے پر گذارا کرتا رہا۔

راتوں کو اکثر کرکٹ کے میدان میں جا کر دوڑنے کی کوشش کرتا لیکن سب کچھ عبث تھا۔ دل پریشان اور سب سے متنفر، سچ یہ ہے کہ میں اپنی حالت اور اپنے آپ سے بیزار تھا۔ سید عبدالحفیظ اور محمد امین ہمیشہ میری حرکات سے باخبر رہتے۔ اسی حالت میں ایک سال گذر گیا اور ایکبار اور پھر امتحان (ایف اے) میں فارسی میں ناکام ہوا۔ میرے کو مارے شاہ مدار۔ میں فارسی کو مادری زبان خیال کرتا تھا اور کبھی کورس دیکھنے کی نوبت نہ آتی تھی۔ ایں ہم رفت۔

ایک شام کو میری حالت ناگفتہ بہ تھی۔ ڈائننگ ہال میں گیا مگر کھانے کو طبیعت نہ چاہی۔

سید عبدالحفیظ نے بہت پکڑا لیکن کھانا نہ کھایا گیا، اور کمرے پر آگیا۔ وہاں محمد امین صاحب موجود تھے۔ تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد انھوں نے ایک ہی ہمدردانہ آواز میں مجھ سے کہا کہ بھائی تمھاری حالت سے میں ڈر رہا ہوں۔ جرأت نہیں کرسکتا۔ معاملہ کیا ہے بتاؤ؟ انکے اس کہنے نے بڑا اثر کیا۔ میرا دم گھٹنے لگا۔ آخرش چہرے کو دونوں ہاتھوں میں چھپانے میں چند منٹ تو بیٹھا رہا، مگر تھوڑی دیر کے بعد قلعہ کی راہ لی)۔ میں نے ٹھان لیا تھا کہ تحت یا تختہ۔ سید والے گیٹ سے باہر نکلا تو ٹرین کے آنے کی آواز [illegible] میں دیوانگی میں اس کو دیکھنے کیلئے زور سے بھاگا۔ میں نے پھاٹک پر ٹرین کو جالیا۔ میرے بعد سید عبدالحفیظ میری جستجو پر میرے کمرے میں پھر آئے۔ کمرہ میں یہ واقعہ سنکر وہ جلدی جلدی میرے پیچھے آئے اور اسوقت جبکہ میں پھاٹک پر سوار گذرتی ہوئی ٹرین کو دیکھ رہا تھا، انھوں نے میری ٹانگ پکڑکر کھینچ لیا۔ ٹرین گذر چکی تھی۔ ہم دونوں قلعہ کی طرف چلے۔ عبدالحفیظ نے مجھسے کہنا شروع کیا کہ بھائی سچ بتاؤ تمھیں کیا فکر ہے؟ میں نے سوال کو کاٹ کر انسے کہا آؤ قلعہ تک دوڑیں۔ ہم دوڑے تو میں نے محسوس کیا کہ میں کالج کے اعلیٰ ترین دوڑنے والے سے بہت زیادہ کمزور نہیں ہوں)۔ قلعہ پر پہنچکر وہ بھی میری دیوانگی میں شامل تھے۔ فصیل پر بیٹھے، کنوے پہ گئے، ادھر گئے ادھر گئے۔ آخرش میں نے عبدالحفیظ سے کہا کہ سچے بھائی تمھاری ہمدردی کا ممنون معاملہ کچھ بھی نہیں۔ موت و حیات کا سوال تھا۔ وہ مرحلہ طے ہوگیا چلو واپس چلیں۔

بارہ بج چکے تھے۔ بنگلے کے کمرے میں آئے تو محمد امین صاحب کو منتظر پایا۔ مجھو واپس دیکھ کر وہ خوش ہوئے اور شوق سے اُٹھے اور کہا کہ چائے پی جائیگی۔ فوراً سماوار میں آگ ڈال میز پر چائے کا سامان سجا سماوار پاس رکھکر حقہ کی سٹک ہاتھ میں لیکر سامنے کرسی پر بیٹھکر مسکراہٹ سے پوچھا کہ اب تو تم بشاش ہو ماجرا کیا ہے؟ میں نے کہا کہ آپکا اور بھائی حفیظ کا نہایت ممنون ہوں۔ خدا نے کیا تو ایک دن عرض کرونگا۔

(نوٹ ۱۹۵۵ء میں جب میں الہ آباد سے یونی ورسٹی ٹورنمنٹ کے مائل ریس Race کا اول تمغہ حاصل کرکے واپس آیا، اور چائے کا دور چلا تو میں نے تمغا محمد امین صاحب کے آگے رکھ کر کہا کہ یہی ماجرا بیان کرونگا میں نے آپ سے وعدہ کیا تھا)

غرضکہ تخت یا تختہ کا سوال حل کر کے مینے مصمم ارادہ کرلیا کہ جو کام دوسرے کر سکتے ہیں میں بھی کر سکتا ہوں میں بھی دوسرے بھاگنے اور دوڑنے والونکی طرح بہترین انعامات حاصل کرسکتا ہوں ۔ میں نے ورزش پر مختلف کتابوں کو پڑہنا شروع کیا اور اپنے آپ کو ٹرین (Train) کرنے کی کوشش کی ۔ اپنی نیند، اپنا کام، اپنی ورزش، اپنے خورد و نوش اور اپنی جسمانی مالش کو باقاعدہ شروع کردیا، تھوڑے عرصہ بعد کالج کی تعطیلوں میں گھر آیا ۔ یہاں آنکر صبح تین بجے مختلف قسم کی ورزش مثل کودنا، دوڑنا وغیرہ شروع کیا (Friction Towels) مالش کرنے کے سخت و درشت تولیہ نے جلدی ہی میرے جسم کو میرے قابو میں کردیا ۔ مجھے دوڑنا تکلیف دہ معلوم ہوتا تھا تعطیلوں بعد کالج پہنچا ۔ اور باقاعدہ فٹ بال میں شامل ہونے لگا فٹبال کھیلنے کے بعد فٹبال فیلڈ کا ایک چکر لگاتا اور صبح کو میرے عزیز دوست نواب غلام محمد خاں صاحب اپنے گھوڑے پر سوار آتے تو قلعہ کو جاتے ہوئے اور واپسی میں انکے ہمراہ دوڑتا چلا جاتا (باقی)

---

(۱)

ہاں دکھادے ای تصور پھر وہ صبح و شام تو
دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو

منظر بھیا ! تمھیں اس تصور کی قسم جسنے تمھیں حقہ[1] تازہ کرنیکی زحمت سے ہمیشہ بے نیاز رکھا، سچ کہو کہ یہہ شعر کس کا ہے ؟ میں ڈنکے کی چوٹ کہتا ہوں کہ سر محمد اقبال کا نہیں ۔ لارڈ حیات انکے شعر تو شعر ایک ایک جملہ کی ترکیب پچیس برس سے حفظ کئے ہوے ہیں ۔ اچھا انہیں سے پوچھو کہ یہہ شعر کسکا ہے ؟ سر محمد اقبال کا ؟ ڈاکٹر اقبال کا ؟ یا اقبال کا ؟ وہ بے تاشہ کہیں گے کہ اقبال کا ! کیا معنی کہ یہہ شعر انھوں نے اسوقت حفظ کرلیا تھا جب وہ اسکول میں تھے اور ہم بھی اسکول میں ۔ یہہ وہ زمانہ ہے جب نہ سر محمد اقبال، سر محمد اقبال تھے، اور نہ ڈاکٹر اقبال پیر اولڈ بوائے

---

[1] تم میرے حقہ کے ہمیشہ دشمن رہے اور ہمیشہ اُسے بدنام کیا ۔ شاید یہہ اسکا بدلہ ہے کہ تمھاری بھٹکی ہوی تیلونیں اسکے بہت کام آئی ہیں ۔

تصور کریں کہ ہم اور حیات وہ نہیں ہیں جو ہیں اور گردشِ ایام ہے کہ پیچھے کی طرف دوڑی چلی جا رہی ہے، حتیٰ کہ لارڈ کرزن ہندوستان کی گورنر جنرلی اور ماریسن صاحب علی گڈھ کی پرنسپلی پر نظر آتے ہیں۔ ان دونوں کی شخصیت کچھ ایسی واقع ہوی ہے کہ گردشِ ایام کی پیچھے کی دوڑ رک جاتی ہے اور جیسا کہ تمہیں معلوم ہے ہم پہلی پہل اٹاوہ سے علی گڈھ کو روانہ ہوتے ہیں۔

بے پڑھائے جو پہلا سبق ہمنے پڑھا تھا یا یوں کہئے کہ تجربے کی بنا پر ہمیں جو محسوس ہوا تھا وہ یہ تھا کہ فوٹو مائیٹر کرکٹ کپتان بڑی ہستیاں ہوا کرتی ہیں۔ انسے بڑھکر کالج میں دوسرا نہیں ہوتا۔ انکی قابلیت کا ہم پا اتنا رعب تھا کہ جب سید علی حسن صاحب کی بی۔ اے میں فیل ہونیکی افواہ (جو بالکل خلاف واقعہ تھی) مشہور ہوی، تو ہم نے کہا کہ کپتان صاحب کیا فیل ہو سکتے ہیں، وہ خود ایک سال کپتانی کرنے کے واسطے فیل ہو گئے ہیں۔ چونکہ وہ ہمیں کھیلنے کو کرکٹ کی خراب شدہ گیندیں دیدیا کرتے تھے، اور ہم چھوٹے لڑکے کھرنیوں کے درختوں کے نیچے سڑک پر خوب کھیلا کرتے تھے، اسلئے ہر بچے کی زبان پر یہی الفاظ چڑھ گئے، اور شدہ شدہ یہہ خبر تیرہ نمبر تک پہونچی چند روز بعد اس عقیدہ کا صلا ہمیں چار وکٹ کی شکل میں عطا ہوا، اور ہم لوگ کمرے سے درخت کی تلاش میں دور جانیکی زحمت سے بچگئے۔ علی گڈھ میں رہتے رہتے جب کچھ شعور آیا، تو ایک بڑا راز ہم پر یہہ کھلا، کہ قوم کی لیڈری بلا سر سید کی قبر کی جاروب کشی کے، حاصل نہیں ہوتی، اور قوم میں امتیازی درجہ حاصل کرنے اور لاٹ صاحب تک پہونچنے کا موقع کالج کا کارکن بنے بغیر مشکل سے ہاتھ آتا ہے۔ لیگ کا تو وجود بھی نہ تھا اور کانگریسی مسلمانوں کے نمائندے نہ قوم کی نظر میں تھے، نہ گورنمنٹ کی۔ غرضکہ مسلمانوں کی موت و زندگی وابستہ تھی علیگڈھ موومنٹ Movement سے افراد قوم کو علیگڈھی حلقے میں شریک ہونیکی کوشش کرتے ہوئے، ہمنے بڑے بڑوں کو دیکھا ہے۔ قوم میں علیگڈھ والوں کی ایک خاص عزت تھی، اور ملک و حکومت علیگڈھ کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتی تھی علیگڈھ کا طالب علم خواہ اسکول کا ہو یا کالج کا جب دوسری درسگاہ میں جاتا تھا، تو پرنسپل اور ہیڈ ماسٹر آنکھوں پر بٹھاتے تھے۔ ہم ہی ایک نہیں بلکہ یہہ دن کرکٹ ٹیم کی جان شفقت نے بھی دیکھا ہے۔ ممو اور رضا نے بھی یہہ بہار دیکھی ہے۔ جن باسیت کا سہرا مصطفےٰ حسین صاحب جن کو انکے ہم عمر جنتا کے نام سے یاد

کرتے ہیں، کے سر پر بھی باندھا گیا ہے۔ اسکول سے جانکی شان لطف احمد، تبارک، منظور، نواب (ہائے کس جوان مرگ کی یاد آگئی) نے دیکھی ہے۔ جہاں جاتے تھے اس درسگاہ میں شور مچ جاتا تھا۔ طالب علمی کا ہے کو تھی اسکول اور کالج پر حکومت کرتے تھے اور ہم تھے کہ جہاں بن بابیت کا زمانہ ختم ہوا پھر علی گڈہ داخل ہوا۔ اسپی پر میر ولایت حسین صاحب جس محبت سے ہمیں پھر داخل کرتے تھے اُس کا مزا کچھ وہی جانتے ہیں۔ یاد واپس آنیوالے خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا اب سمجھ لیجئے کہ ہم ۲۸ء۱۹ میں نہیں ہیں، بلکہ سنہ ۱۹۰۱ء شروع ہوا ہے۔

کرکٹ نہایت زوروں پر ہے۔ پیویلین (Pavalion) تیار ہو چکا ہے لیکن سامنے کی لان اتنی وسیع نہیں ہے، اور نہ اسپرٹینگ کا بوجہ ڈالکر سبزے کی قدرتی سبزی کو پیٹنے کا خیال کھیلنے والوں کے دل و دماغ میں اسوقت آیا تھا۔ کلن کے سپرد کرکٹ کا سامان تھا اور جسطرح کہ اُسکے صاحب کل کالج کے کپتان یعنے فرسٹ الیون کے کپتان تھے اسیطرح یہہ بورڈنگ ہوس کے ملازمین کا کپتان تھا چونکہ اسکے صاحب بھی بولر تھے لہذا یہہ بھی چھٹی کا وقت بولر بننے میں صرف کرکے بولر بنگیا تھا۔ اسکے بعد اس کا جانشین ممتاز جو شروع میں مرزا محمود بیگ صاحب کے پاس ملازم تھا، کرکٹ کلب کا ملازم ہوکر، ملازمین کے ٹیم کا کپتان بنا، اور اکثر اپنی ٹیم کو شہر کے باہر بھی لے گیا۔ نہ معلوم اب یہہ سلسلہ ملازمین کی ٹیم کا جاری ہے یا بند ہو گیا۔ لان کے شمال بجنوب وسیع میدان تھا۔ شمال کیطرف مسجد کے دیوار کے پیچھے اکثر تھرڈ الیون و کالج الیون کو میچ کھیلنے کا موقع دیدیا جاتا تھا۔ شمال میں آگے چلکر ایک سمت ہٹا ہوا۔ رائے ڈنگ (Riding) اسکول تھا اور باقی اللہ کا نام نہ اسطرف اردو ہندی کے معرکوں کا نتیجہ میکڈانل بورڈنگ ہوس منجو کا وہم و گمان تھا اور نہ Swimming Bath) سوئمنگ باتھ اور دوسری بورڈنگوں کی تیاری کا کسی کے دماغ میں خیال آتا تھا۔ البتہ کالج کی چار دیواری کے قریب دھونی رماکر بیٹھنے کا خیال صاحبزادے صاحب کے دل میں ضرور تھا، جسکو آج آپ سڑک اس پار آفتاب منزل کی شان وار شکل میں دیکھ رہے ہیں۔ اللہ جانے اُنھی دیکھا دیکھی یا خود بخود جعفر منزل بناکر علی گڈھی ہو جانا، سید جعفر حسین صاحب انجینیر کو بھی پسند آیا اور چند سال بعد اُنھوں نے کھڑی چار پائی پر بیٹھ، عینک لگا، اپنے بنگلے کا ہی نہیں، بلکہ کالج کے اکثر بورڈنگ ہوسوں کا نقشہ بنانا شروع کر دیا۔

آئیے اب ذرا سید احمد خانی بستی میں اللہ کے گھر کی سیر کیجئے۔ جب ہم علی گڈہ پہنچے تو مسجد کی پچھلی دیوا

اور بیچ کا گنبد تیار تھا۔ اسکے متعلق علی رضا بلگرامی صاحب سے (جو ہم سے عمر میں خاصے بڑے ہیں گو سکنڈ ایر میں پہونچکر جب ہم اور وہ ہم سبق ہوے تو کچھ انھوں نے اپنی عمر گھٹا دی کچھ ہم نے اپنی عمر بڑھا دی) یہہ روایت معلوم ہوئی کہ سرسید کا خیال دو مسجدیں بنانے کا تھا، مگر انکے چچا نواب عماد الملک مرحوم نے اس خیال کی سخت مخالفت کی، اور صرف ایک ہی مسجد بنا قرار پایا، جہاں سُنی شیعہ دونوں نمازیں پڑہیں۔ چونکہ جنگ بلقان تک، یا اگر آپ زیادہ صحت چاہتے ہیں تو نواب وقار الملک کی آمد آمد تک، نماز روزے کوئی زیادہ اہمیت نہ رکھتے تھے، ہم نے اس معاملے کے معلوم کرنیکی فکر نہ کی۔ دوسری روایت ہمارے عزیز دوست مرزا بشیر بیگ صاحب نے جواب نواب بشیر یار جنگ ہیں، مسجد کے دیوار کی طرف ہاتھ اٹھا کر یوں سُنائی کہ دیکھو "ابی آن" کے ہٹ یہاں آکر پڑی تھی سرسید اور شمحمود کے مقبرے بن چکے تھے، اور نئی بارگ کی طرف مولوی عبد اللہ صاحب کے رہنے کا کمرہ موجود تھا۔ وسیع صحن میں برسوں اینٹوں کا انبار لگا رہا، اور یہہ سلسلہ نئے بارگ کے سامنے تک چلا گیا تھا، اگرچہ یہہ انبار آنے جانیوالوں کو ناگوار گذرتا ہوگا لیکن اسکی توقیر اس بیچارے وارفتہ بانتظار دیدار سے پوچھئے جس کا کام پڑہنا لکھنا چھوڑ محض اسی پر بیٹھے رہنا تھا۔ نماز کی حاضری کم سے کم دو مرتبہ لازمی تھی، اور کالج و اسکول سے قبل آدہ گھنٹہ دینیات کا درس ضروری تھا۔ رجسٹر ایک مانیٹر کے سپرد تھا، اور حاضری وغیر حاضری میں، اگرچہ انکے الطاف وکرم کو بہت دخل تھا لیکن پریٹر مانیٹر بس پریٹر مانیٹر ہی تھا۔ مانیٹری کی شان آگے چلکر بھائی ناظر نے قائم کی، اور بڑے بڑوں کے چھکے چھڑا دیئے۔ چونکہ یہہ مدتوں ہمارے کلاس فیلو رہے ہیں اسلئے انکو بھائی لکھا ہے۔ ناظرین کرام یاد رکھیں کہ علی گڈھی زبان میں بھائی۔ برادر۔ بڑے بھائی۔ چھوٹے بھائی علحدہ علحدہ معنی رکھتے ہیں اور بھیا ایک آرڈر آف میرٹ (Order of Merit) ہے جو قسمت والوں کو ہی حاصل ہوتا ہے۔ القصہ مسجد کی تعمیر اکثر شروع ہوی اور بند ہوی اور یہہ قصہ امیر کابل کی تشریف آوری تک چلتا رہا۔

سوائے اسٹریچی ہال کے دوسرے شاندار کمرے تیار نہ ہوے تھے، اور اسکے دونوں طرف سے دو چھوٹے چھوٹے راستے پکی بارگ سے کچی بارگ میں جانیکے تھے۔ مشرق کی طرف اسٹریچی ہال کی عمارتوں کے سلسلے میں ہی، ایک کوٹھری تھی، جس میں کرکٹ کا سامان رہتا تھا۔ کالج کلاس کے قریب اسی لائن میں

صرف مہدی منزل مکمل ہو چکی تھی، جس میں نواب محسن الملک کا دفتر تھا، اور سجاد حیدر صاحب انکی پرائیوٹ سکرٹری کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔ پکی بارگ کے پہلے نمبر میں مارین صاحب کا دفتر تھا، اور اسکے بعد دوسرے کمرے میں برسر صاحب کا دفتر۔ پکی بارگ اُدھر سے سو گیٹ کے تیار ہو چکی تھی۔ گیٹ کی دوسری طرف صرف ایک دو کمرے تیار ہوئے تھے۔ تعمیر جاری تھی، اور دیوار اتنی اونچی نہ تھی کہ لڑکے کود کر راتوں کو سامنے والے آم کے باغ میں دست درازی نہ کر سکیں۔ دو تین سال میں یہہ لائن پکی ہو کر نئی بارگ سے جا ملی، اور نئے بارگ کے پاخانوں پر جہاں اب لا کلاس کی تعلیم دیکر ایل۔ ایل۔ بی نکالے جاتے ہیں، اس سمت کی پکی بارگ والوں نے اپنا قبضہ بھی شروع کیا۔

نئے بارگ اگرچہ اپنے آغوش میں زیادہ بچے نہیں لے سکی، اُسنے وقتًا فوقتًا ہر قماش کے اہل فن نکالے ہیں آنکھ والے، زباں والے، بننے والے، بنانے والے، پڑہنڈرے، کھلنڈرے، گانے والے، گُن گنانے والے، اور تو اور اللہ رسول والے سب طرح کے لوگ ان کمروں میں نظر آئیں گے۔ انہیں سے کوئی ڈپٹی ہوا کوئی مصنف۔ کوئی وکیل، کوئی قومی درسگاہ کا ہیڈ ماسٹر، کوئی بیرسٹر، کوئی پی۔ ایچ۔ ڈی، کوئی پرنسپل، ایک تھانہ دار، اور ردولی والے صاحب تحصیلدار۔ خوب یاد آیا جو صاحب ہمارے فیاض پریسیڈنٹ نواب سر محمد فیاض علی خاں مرحوم کے پرائیوٹ سکرٹری ہوئے، وہ بھی بفضل الٰہی سے نئے بارگ اولوں ہی سے تھے۔

چشم فلک کی نظروں میں یہہ عمارت کالج کی بڑہتی ہوی شان دیکھ کر کچھ ایسے کھٹکی، کہ بہاوڑے چلوا دیئے، ورنہ یہہ بارگ تو بارگ اسکے کچے پائخانے کالج کی تاریخ میں وہ اہمیت رکھتے ہیں کہ آثار قدیمہ نہیں تو، روایات قدیمہ کو قائم رکھنے کیسلئے، محفوظ کرنیکے قابل تھے۔ اسکی دیواروں پر مشق کرتے کرتے بہت سے کہنہ مشق شاعر اور مضمون نگار ہی نہیں، بلکہ ایک ایڈیٹر بھی نکلے ہیں۔ انھیں میں سے ایک دروازہ باہر جانے کو تھا جو شام ہی سے مقفل کر دیا جاتا تھا، اور اسکے ساتھ ہی ساتھ مسجد والا گیٹ بھی بند ہو جاتا تھا۔ آمد و رفت صرف صدر گیٹ سے رہجاتی تھی، اور وہ بھی کھڑکی ہو کر، جہاں سے نو بجے کے بعد بغیر رجسٹر پر دستخط کئے ہوئے آنا جانا کا[illegible] دار دتھا۔ ایک ایک [illegible] [illegible] کر کے خان ایسا ہوشیار تھا کہ

دستخط کرائے بغیر کھڑکی سے نکلنے ہی نہ دیتا تھا۔ ذات کا پٹھان اسپر مارسین صاحب کا منہ چڑھا، وہی ٹل کر
کر لیا اور وہ بھی نیم چڑھا۔ بی۔اے۔ ایم۔اے والے تو کجا سب پراکٹروں کی نہ مانتا تھا، اسکول بورڈنگ میں
صرف ظہور وارڈ، اور مارسین کورٹ اور تھے، جیسے ڈنیچر کھا کرتے تھے۔ چند بنگلے اسکول کے سامنے اور کچھ
یونین کی پیچھے تھے، جن میں ہندو طلبا، مدرس، ماسٹر، دفتری لوگ رہتے تھے۔ انھیں میں سے کسی بنگلے کے
ایک کمرے میں ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب ڈی۔ایس۔سی کے امتحان کی تیاری میں مشغول رہا کرتے تھے۔
یونین کے سامنے چھوٹی سی لان مہندی کی جھاڑی سے گھری ہوئی تھی۔ یہاں ٹینس ہوا کرتی تھی۔ عام
طور سے کالج کے طلبا میں اس کا رواج نہ تھا۔ جو لڑکے کرکٹ اور فٹ بال نہ کھیلتے اکثر کمرے کے سامنے
چارپائی کھڑی کر کے ٹینس کا شوق پورا کر لیا کرتے تھے ٹینس کھیلنے والوں میں پروفیسر ابوالحسن صاحب کا بہت
زور تھا۔ سال میں ایکدفعہ نواب نذیر جنگ بہادر حیدرآباد سے علی گڈہ جایا کرتے تھے، اور پروفیسر صاحب کو
سیٹ اور یہیں نمائش کے خرچ کو اشرفی دیا کرتے تھے، جو نمائش کے پراٹھے کباب کے نذر ہو جاتی تھی۔
کالج کے خونچے والوں پر اس اشرفی کے "ضرب" مہینوں پڑتی تھی، اور مزے سے قرضے پر کاروبار چلتا تھا۔
مسٹر براون اور مسٹر کارنا حال ہی حال میں آئے تھے، اور انگلش وارڈ فلر ہاوس میں براؤن صاحب کے تحت
کھولا گیا تھا۔ محمود، مسعود، صادق علی خاں میں منتقل ہو گئے تھے، اور خوشی خوشی براؤن صاحب کے کندھوں پر
بیٹھا کرتے تھے۔ مارسین صاحب نے تو نواب صاحب مرحوم سے مجھے بھی وہیں بھیجنے کو کہا تھا، مگر وہ کلکتہ
چلے گئے۔ مارسین صاحب کی بات اور نوابصاحب ٹالتے؟ میری بہن ٹرک اور ماموں محمد عثمان صاحب کے کہنے
سننے سے ہفتہ دو ہفتہ کوٹھی پر رکھ کر نواب حسین مرحوم کے کمرہ کو ڈبیچر میں بھجوا دیا۔ ڈنیچر خاص طور پر اسکول کے
طلبا، کیلئے مخصوص تھا اور چھوٹی عمر کے لڑکے جیسے اٹھارہ برس کے سام مرزا بھی شامل ہیں، ظہور وارڈ
میں رہتے تھے۔ پکی اور کچی بارگ میں بھی اسکول کے طلبا، کی ممانعت نہ تھی، بشرطیکہ کوئی عزیز یا کم سے کم بڑا
بھائی کالج میں پڑھتا ہو۔ ظہور وارڈ پر مولوی سلیم کی حکومت تھی اور اسی سال مشہور ڈاکٹر ضیاء اللہ خاں مرحوم
بھی اسکے سب پراکٹر ہوئے تھے۔ ظہور وارڈ میں ہی رنگین پٹیالی صافوں کا زور تھا۔ انگلش ہوس پر کچھ دن بعد
یہ رنگ چھایا۔ اس سے کچھ دور ہی اسکول کے بنگلے تھے۔ کارنا صاحب ہیڈ ماسٹر تھے، اور میر صاحب سکنڈ ماسٹر

ظہور وارڈ کے سامنے درختوں کے پیچھے ایک صاحب گرمی ہو یا سردی دھڑا دھڑ کرکٹ کھیلا کرتے تھے۔ برسوں سے یہ حیدرآباد کی محمڈن ٹیم کی جان ہیں۔ بولنگ بھی کرتے باونڈریاں بھی لگاتے ہیں ان کی خاص خصوصیت ہے "بھیّا منٹ" (Just a minute) ۲۷-۲۸ برس پہلے کا قصہ ہے۔ ۲۰-۲۲ برس کی عمر کے پیر نابالغ مغالطہ نہ کھا جائیں۔ روئے سخن کرنل صاحب یا میجر صاحب کی طرف نہیں ہے بلکہ یہ وہ صاحب ہیں جو ہمارے کلاس فیلو تھے۔ انکے چھوٹے بھائی بورڈ سے ہمیشہ کھریا کا ٹکڑا اٹھا لیا کرتے تھے، اور اس پنسل سے تصویر بنایا کرتے تھے اور اچھی بنانے لگے تھے۔ بڑے بھائی صاحب کا تو شوق مستقل ہے۔ مگر چھوٹے بھائی صاحب اب وائرلیس کے دلدادہ ہیں۔ کلمبو، کلکتہ، بمبئی کے گانے سنا کرتے ہیں۔ یہ تو بورڈنگوں کا تذکرہ ہوا۔ بس یہ ہی چند مقام رہنے کے تھے! البتہ ایک بنگلے میں جو مارلین صاحب کے قریب تھا اس میں مسٹر وائنیس کی نگرانی میں محی الدین مرزا و معین الدین مرزا تھے، اور مارلین صاحب کے ساتھ سید راس مسعود، ایک زبردست اسکاڈرن اسکول کا تار والے بنگلے میں تھا، یعنے سید ضیاء الدین، سید معین الدین، سید نور الدین اور انکے بھانجے بھوندو۔ پیارے اور داؤد گیارہ بجے رات کو ہم علی گڈھ پہونچے تھے اور صبح انھیں لوگوں سے ہمارے مڈھ بھیڑ ہوئی تھی۔ صورتیں بدلیں، کلکٹر بدلے، کمشنر بدلے، لاٹ بدلے، گورنر بدلے، حتیٰ کہ پایۂ تخت کلکتہ سے بدل کر دہلی آیا، مگر نہ بدلا تو پنجاب میل کا وقت۔ اٹاوے سے شام کے وقت جب چھوٹتا تھا وہی اب چھوٹتا ہے۔ خیر بدلے یا نہ بدلے اب نہ علی گڈھ رہا نہ اٹاوہ، اچھا آگے سنو! رات جیسے تیسے کروٹیں بدل کر کاٹی، صبح جب اٹھے تو ماموں محمد عثمان کو دیکھ کر کچھ دل کی دھڑکن بند ہوئی بشیر بیگ نے اوسان ٹھکانے کئے۔ مولوی زین العابدین صاحب مرحوم صبح کو نواب صاحب کے پاس آئے۔ ہم بھی بلائے گئے۔ مرحوم نے بڑی محبت سے پیار کیا۔ خوش خوش ہم مرزا محمود بیگ صاحب کی کمرہ کے طرف واپس آئے۔ دیکھا کہ ایک منڈے کا منڈا چلا آرہا ہے، جسمیں قد کے لحاظ سے میاں داؤد تو سب سے چھوٹے تھے اور ضیاء الدین مرحوم سب سے بڑے۔ مرزا محمود بیگ صاحب سے پوچھا کہ یہ کون بزرگ ہیں۔ نام بتایا گیا۔ دونوں بھائی تو چپ رہے، اگر مرحوم نور الدین جو اسوقت سے بی۔ اے تک ہمارے ساتھ فیل پاس ہوتے رہے۔ بتحاشہ ہماری طرف دوڑے، اور کہنے لگے کہ میاں زین العابدین تم کو نواب صاحب خوب پکڑ لائے (سنہ میں جاکر

پتہ چلا کہ یہ سید معین الدین صاحب کی عنایت تھی) اگر یہ نام دوسرے کو ملتا تو پھیل جاتا مگر ہمارے اور
نور الدین اور بشیر ہی تک رہا۔ کبھی سید معین الدین صاحب بھی کہہ لیتے تھے۔ ہزاروں پھبتیاں آگے چلکر ہم پر کی گئیں
اور لاکھوں پھبتیاں ہم نے اوڑائیں، مگر اس پہلی پھبتی سے جو صورت ہماری نکل آئی تھی وہ بشیر سے نہ دیکھی گئی،
اور اُسنے فوراً ہی گرج کر ڈانٹ دیا کہ خبردار میرے بھائی کو نہ چھیڑنا، اور چپکے سے کہا کہ وہ رو دے گا۔
اسپر مرحوم نے ایک فرمائشی قہقہہ لگایا، اور ہمسے کہا کہ یار گھبرانا نہیں، تم کو کالج میں کوئی نہیں چھیڑ سکتا۔ غرض
وہ دن گیا گزرا ہوا۔ جنیسے کوٹھی پر رہ کر ہم نواب مرحوم کے ساتھ ڈینچ کے آٹھ نمبر کے کمرے میں آکر رہنے لگے
اور نئے پرانے ہوگئے۔ میر ولایت حسین صاحب کے صاحبزادے میاں محمود مرغیوں کے بہت شائق تھے،
انکے مرغیاں اکثر ڈینچ کے کپاونڈ میں پھرتی تھیں۔ محمود کی موجودگی ہی میں ایک نہ ایک مُرغی ہم لوگوں کے
ہاتھ پڑجاتی تو میاں محمود روتے ہوئے گھر جاتے تھے۔ یار لوگ میر صاحب کے آتے آتے بھون بھان نوش جان
کرلیتے تھے، اور میر صاحب غصہ تو بہت ہوتے تھے مگر غصہ کا اظہار صرف اس سے زیادہ نہ کرتے تھے کہ "چھوا
میری محمود کی مرغی اور تیرا منہ"۔ اسی بورڈنگ میں محمد ذکی جو آگے چلکر خبر نہیں کہ کیا ہوے تھے، اور صمد، بشیر،
سید احمد، محفوظ شمالی جانب کے آخری کمروں میں شان پہلوانی دکھانے والی جنگوں کے تیاریاں کیا کرتے تھے،
چچا ضیاء اللہ خاں مرحوم کے ظہور وار ڈبہو نجنے کی بدولت علی محمد خاں یہاں کے سب پراکٹر ہو کر آگئے تھے
اور دوسرے سب پراکٹر نیاز محمد خاں تھے۔ یہہ دونوں ہمیں اسکول میں پڑہاتے بھی تھے جہاں بورڈنگ میں
کسی شرارت کا حال انکو نہ بتایا تو اسکول میں امپوزیشن کی دھمکی دیکر سب معلوم کر لیا کرتے تھے۔ ہمیں بورڈنگ
میں مہینہ بھر بھی نہ گذرا تھا کہ یہہ معلوم ہوگیا کہ سب پراکٹر سے جھوٹ بولدینا فیشن میں داخل ہے اور شرارت
کرنیوالوں کا حال کہدینا بڑا گناہ ہے۔ اس زمانے میں ہاکی کا رواج ہی نہ تھا۔ کرکٹ اور فٹ بال صرف
دو کھیل تھے۔ اور ایک دوسرے کے مقابل کرکٹ کے کپتان سید علی حسن اور فٹ بال کے کپتان عبدالحمید خاں
تھے۔ چونکہ از الف تا یے ہمارے دوست و احباب کرکٹ والوں میں تھے لہذا وہاں تو ہمیں انسے
ملنا نصیب نہوا، حیدرآباد میں ملاقات ہوی۔ یہاں آکر انھوں نے Co-operative so'ties بنا ڈالی،
ہم جب انسے ملے تو بہت محبت سے ملے۔ آہ یہہ محبت یہہ خلوص ان لوگوں میں بھی ہوتا جو اسٹرائک کے بعد

علی گڈھ لائف سے مستفید ہوے۔

سید علی حسن صاحب حسب رواج قدیم ۱۳ نمبر کی بارگ میں تھے، اور خان جی صاحب کچی بارگ میں۔ اسی بارگ کے آخری کمرہ میں اسکول الیون (Eleven) کے کپتان عابد حسین خاں، جو انٹرنس کے امتحان میں فیل ہوا کرتے تھے رہتے تھے۔ جب ہم پہونچے تو یہہ الہ آباد اور پنجاب دونوں کا امتحان دیا کرتے تھے، اور فیل ہوتے تھے۔ اکثر انکے فیل ہونے کی خبر صبح کے وقت ۹ یا ½ ۹ بجے ڈائننگ ہال میں لاکرتی تھی، اور یہہ حضرات ½ ۴ بجے تک کمرے میں بند سوئی کیا کرتے تھے۔ ½ ۴ بجے ہم عمر دوستوں کا ایک باقاعدہ ڈیپوٹیشن انکے کمرے پر جاتا تھا اور سب کہتے تھے کہ ٹورنمنٹ قریب ہے، خدا کے واسطے کالج کا ستیاناس مت کرو۔ انکی تکیے کے نیچے سے انکی پتلون نکالتے تھے، اور یہہ منہ بنا کر پہن لیا کرتے تھے۔ مغرب بھی ہونے پاتی تھی کہ پھر یہہ جیسے کے ویسے ہو جاتے تھے۔ سکنڈ الیون کی کپتانی عابد جعفری کے سرمنڈھی گئی تھی۔ کالج الیون کے کپتان کی صورت اسوقت میرے آنکھوں میں ہے، مگر نام یاد نہیں آتا۔ اس زمانے کی فرسٹ الیون کا کیا کہنا۔ سکنڈ الیون صوبے کی سب سے اچھی ٹیم تھی۔ مگر کالج الیون کی ٹیم بڑی لچر۔ فرسٹ اور سکنڈ الیون ایک نیٹ پر، کالج الیون دوسری جگہہ اور تھرڈ الیون نئی بارگ کی طرف کھیلتی تھی۔ سکنڈ الیون کی کپتانی خاص اہمیت رکھتی تھی، اور یہہ ان لوگوں کو ملتی تھی جن کے خدا ماہم ہون کھیل کی یہہ حالت ہوتی تھی کہ جب تک فرسٹ الیون کے قابل نہوں نہ دیجاتی تھی گر یہہ فرسٹ الیون کی کپتانی سے مستقل عہدہ تھا جو برسوں رہتا تھا۔ اگر میری یاد خطا نہیں کرتی تو جعفری کے بعد عبدالحق۔ عبدالحق کے بعد عزیز اللہ عزیز اللہ کے بعد آل محمد انکے بعد غالباً حیات اور پھر ہم کپتان ہوے۔ ۱۹۰۱ سے ۱۹۱۲ تک کا یہہ سلسلہ ہے اور ہم میں سے صرف آل محمد ہی کو فرسٹ الیون کے مستقل ممبری نصیب ہوی۔ ورنہ دوسروں کو ہمیشہ فرسٹ الیون کی ٹیم میں بحیثیت اکسٹرا کے اسکورنگ یا امپائری پر اکتفا کرنا پڑا۔ امپائری کا سہرا آگے چلکر حیات کے سر رہا۔ اسکول الیون کا کپتان ہمیشہ فرسٹ الیون کا ممبر ہوتا تھا۔ لیکن کالج الیون کا کپتان سکنڈ الیون سے بھی محروم۔ اسکی وجہ کچھہ تو کھیل میں نیازمندی، کچھہ کالج میں پڑھنے کا غرور۔ علی حسن صاحب کے بعد سید محمد خاں صاحب، پھر مرحوم عبداللہ صاحب کپتان کے چھوٹے بھائی محمد اکرم صاحب،

بعہ سلام الدین صاحب، پھر اُستاد حلیم، انکے بعد احمد علی صاحب اور انکے بعد آل حسن صاحب اس عہدہ جلیلہ پر سرفراز ہوے۔ یہاں پر ایک عجب لطیفہ یاد آیا۔ احمد علی آل حسن ہم ساتھ ساتھ بی۔ اے کے امتحان میں گئے۔ اگر آل حسن پاس ہوجاتے تو بڑے صاحب کی جانشینی میں فرق آجاتا۔ غرض بڑے مرکے کلاس تھا۔ آخر ش ایک سال کپتان رہی لئے، اور اچھی کامیابی حاصل کی۔ انکے بعد پٹیالے والے عبدالوحید کا نمبر آیا۔ اور وہ تیرہ نمبر میں رونق افروز ہوے۔ انکی ٹیم کی واپسی پر ہم نے ایک باعی بھی کہدی۔ خفا نہونا، اُس زمانہ میں ہم ایسے ہی شاعر تھے۔

ہے نیک فال پہلی ظفر یہہ وحید کی	اور ایسا ایک سینچری بھی مزید کی
حلوای کی دوکان سے مٹھائی منگائی ہے	اب تاب ہی نہیں رہی وعدی وعید کی

کرکٹ کپتانی کے ساتھ بڑی قید یہہ لگی ہوی تھی کہ بی۔ اے کلاس کا طالب علم ہو۔ اس کا نتیجہ یہہ ہوتا تھا کہ سکنڈ ایر میں برسوں رہنے والے اس نعمت سے مستغنی رہتے تھے اس دروِ استغنا کو رضا محمود بھوندو شفقت کے دل سے پوچھئے۔

بورڈنگ ہوس کی دیواریں مسٹ و مسٹ ناٹ (Must and Must not) کی تختیوں سے مزین نہتیں اور سوائے ظہور وارڈ کے باقی سب بورڈر ڈائننگ ہال میں آکر کھانا کھاتے۔ یہہ عمارت پکی بارگ کی دو بارگوں کے درمیان مدت سے تیار تھی، اور مطبخ سڑک کے اُس پار جہاں پہلے تھا وہیں اب بھی ہے۔ ڈائننگ ہال کا لطف کچھ دیکھنے ہی سے تعلق رکھتا ہے۔ ہائے کسی اولڈ بائے نے کیا ہی بڈھب کہا ہے:

آتا ہے یاد اکثر کالج کا وہ زمانا	وہ نت نیا تماشہ وہ نت نیا ترانا
وہ دال ملنیٹر سے جنگ و جدال کرنا	اور بھیرویں کی لے میں پشتو کی گیت گانا
ہوتا رکابیوں سے جب ہال رشک گلشن	شاخ کباب پر تھا اختر کا آشیانا
ایک مصرع بھولگیا۔	بیچیش بھی ہے تمہاری اک فتر ابھانا
جب پچھلی رات آئی تھی باغ پر چڑھائی	گٹھلی کی چاندماری چھلکے کا تھا نشانا

بڑی خوبی ڈائننگ ہال کی یہہ تھی کہ مزے میں ذرا فرق نہ آتا تھا جو گوشت کا مزا آج ہے وہی پہلے

دن تھا، اور جو آج ہے وہی قیامت تک رہے گا۔ ۱۹۱۰ء سے ۱۹۱۵ء تک کی تو ہم کہہ رہے ہیں۔ کالج یونیورسٹی ہوکر بدل گیا ہو تو خدا جانے۔ بدھ اور اتوار کو صبح کے وقت پلاؤ بھی ملجاتا تھا، اور جمعہ کو شہر جاتے جاتے ایک فرنی اور ایک زردہ کی رکابی اور نوش جان ہوجایا کرتی تھی! اسکے علاوہ باقی دنوں میں دونوں وقت ایک گوشت کی رکابی اور دال چپاتی یا آبی تنوری روٹی جتنی کھاسکیں کھالیجئے، مگر کمرے بد چھ سے زیادہ چپاتی اور تین سے زیادہ آبی روٹی نہیں مل سکتی۔ مانیٹروں کا لطف وکرم دوسری بات ہے۔ یا وہ ترکیبیں، جو اُستاد لوگ سینہ بسینہ تلقین کرتے ہوئے چلے آئے ہیں، اور جسکے لئے دل کی قوت اور ہاتھ کی صفائی درکار ہے، اس کا ذکر شرارتوں کے سلسلے میں آئیگا۔ میر عاشق علی صاحب مرحوم ٹرسٹیوں کی طرف سے ڈائننگ ہال کے نگران تھے، اور ٹمنگ صاحب سے بگڑ کر کہا کرتے تھے کہ میں بھی کالج کا ٹرسٹی ہوں۔ پلاؤ کی تعریف ایک صاحب نے کیا خوب کی تھی کہ صبح کو دھو کر چاول بنئے اور گوشت قصاب کے ہاتھ بیچ لو۔

ڈائننگ ہال کا وقت صبح کے ۹ بجے اور شام کو نماز مغرب کے تقریباً آدھ گھنٹے بعد۔ بارگ کے بیرے آکر دال کی رکابیاں میز پر جما دیتے تھے، اور گوشت کی رکابی مانیٹر صاحب کے سامنے بھری جاکر بانٹ دیں میں رکھ دیجاتی تھیں۔ دس پانچ نادر رکابیاں مخصوص ہوا کرتی تھیں۔ مانیٹروں کے لطف وکرم بعض بعض دن تو خشکہ و کباب بھی کھلا دیتے تھے۔ گوشت کا دیگچہ آتے ہی دونوں طرف کے دروازے بند کردیے جاتے تھے، اور پھر جب میز تیار ہوجاتی تو ایک سپاہی بارگ کے برآمدے میں جاکر اور پھر باورچی خانہ کی طرف آکر زور سے گھنٹی بجاتا تھا، اور ہم لوگ جمع ہونا شروع ہوجاتے تھے۔ اپنے بل بوتے پر نادر رکابی حاصل کرنے کے لئے پہلے ہی ریلے میں داخل ہونا ضروری سمجھتے تھے، اور داب کر وہ ہاتھ میں رکابی صاف کرکے بیرا بیرا پکارنا شروع کرکے مانیٹر صاحب کو چکمہ دیئے جاتے تھے۔ اب سنا ہے کہ دنیا بھر کی تختیاں ڈائننگ ہال میں لٹک رہی ہیں۔ پہلے تختیوں پر لکھے جانے کا رواج صرف کرکٹ ٹیم (speaking prize) یونین کے وائس پریسیڈنٹ اور سکریٹری کا تھا، اور یہ تختیاں یونین ہی میں لگتی تھیں۔

شہر جانیکے واسطے پاس کی ضرورت ہوا کرتی تھی، اور غالباً جمعہ کو ۲ بجے سے قبل مغرب تک

عام اجازت تھی۔ شہر کے باہر جانے کا پاس لازمی تھا، اور اسکی اطلاع میر صاحب کو دینا پڑتی تھی بورڈنگ میں داخلہ، بورڈنگ سے علٰحدگی، گھر آنے جانیکی اجازت سب میر صاحب کے ہاتھ میں تھی۔ میر صاحب پراکٹر تھے اور باقی دوسرے استاد سب پراکٹر اکثر میر صاحب لالٹین لیکر بورڈنگ میں ۹ بجے کے بعد ٹہلا کرتے تھے۔ انھیں لڑکوں سے محبت تھی اور لڑکے بھی انکا ادب دل سے کرتے تھے خطابات اگرچہ دیئے جاتے تھے، مگر سلطنت مغلیہ ابھی قائم نہ ہوئی تھی اور نہ باقاعدہ گزٹ اکسٹرا آرڈنری شایع ہوتا تھا۔ فاختہ کا رواج تھا، مگر لڑکوں لڑکوں میں۔ گرمیوں میں خاص لطف پلنگ اُٹھانے اور بستروں کو درخت پر رکھ دینے میں تھا۔ ایک گروہ میرے صاحب کا روپ بھر کر اجنبیں سگریٹ یا اسکی قیمت وصول کرتا تھا۔ یہ کھیل جاڑوں کے لیئے مخصوص تھا۔ کبھی نووارد دوست کا روم فیلو میرے صاحب کو اندر داخل ہو جانے دیتا تھا، اور کبھی یہ پارٹی کھڑکی کے پیچھے سے ہوتا تھا۔ اگرچہ پارٹی بندی تھی مگر پلنگ اٹھانے، فاختہ اڑانے، گھر سے آیا ہوا حلوہ کھانے میں اپنے و غیر کی تمیز نہ تھی۔ بننے والے کو بنانا فرض عین تھا۔ ماہرین فن دکھتی ہوئی رگ کا ایک ہی دو دن میں پتہ چلا لیتے تھے۔ یونیفارم کی سختی نہ تھی۔ اسکول کالج میں سوٹ، شیروانی، رام پوری انگرکھا سب چلتا تھا۔ سال کے انوکھے واقعات، نواب صاحب رام پور کی تشریف آوری، لارڈ کرزن کا ورود، ڈانیجر یعنی بارگ کی جنگ، محرم کی لڑائی تھے۔ اسی سال مارین صاحب کلکتے سے ایک تھیٹریکل کمپنی لائے تھے۔ آٹھ دن کی تعطیل دی تھی۔ ٹاؤن ہال میں رومیو جولیٹ کا کھیل ہوا تھا جس کا صرف ایک جملہ "او رومیو" منہ بنا کر ادا کرنا ہم دو چار دوستوں کو یاد رہگیا تھا، جو وقتاً فوقتاً دو چار صاحب پر کس دیا جایا کرتا تھا یا تو حبیب اللہ خاں صاحب ڈپٹی یا اور کوئی صاحب اولڈ بائیز کے سکرٹری تھے اور اسٹریچی ہال میں ڈنر ہوتا تھا۔ اولڈ بائیز (Easter) کے تعطیلوں میں کھیل کود کر اور پھڑوا تقریریں کرکے گھر چلے جایا کرتے تھے جو آگے چلکر ہوا اسکا وہم و گمان بھی نہ تھا بچپن کی باتیں اس سے زیادہ یاد نہیں آتیں۔ کوئی صاحب اگر اور لکھنا چاہیں تو بندہ سننے کو تیار ہے ۔

سید غلام پنجتن

ہمارا کالج

۱۔ ۱۱ فروری ۶۲ء کے سہ پہر میں جامعہ اسلامیہ علیگڈھ کا جلسہ تقسیم اسناد منعقد ہوا۔ ہندوستانی اور یورپین معززین کا کافی مجمع تھا۔ مسٹر او کلڈن کمشنر میرٹھ نے خطبۂ اسناد پڑھا۔ انہوں نے اپنے خطبہ میں مسلم یونیورسٹی علیگڈھ کی روایات اور اسکے کارکنوں کا ذکر کیا، اور طلبہ و طلیلسانیین سے ہندوستان کی عظمت کیلئے انتھک کوشش کرنے اور رواداری کی روح پیدا کرنے کی خواہش کی کیونکہ اُن کی رائے میں رواداری سچی شائستگی کا اعلیٰ ترین کمال ہے۔ نواب سر فضل اللہ خاں بہادر نائب امیر جامعہ نے کہا کہ اسلام رواداری کی تلقین کرتا ہے۔ صاحب موصوف نے ہنود سے بھی اپنے مذہب کا احترام کرنے اور اپنے مذہبی رواداری پر قائم رہنے کی خواہش کی۔ ایک لڑکی ثروت آرا بیگم کو میٹرک میں اول آنے پر طلائی تمغہ دیا گیا۔

۲۔ ہمیں یہ معلوم کر کے فکر پیدا ہو گئی تھی کہ برادرم صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب علیل ہو گئے تھے، لیکن دوستوں سے معلوم ہوا کہ اب بفضلہ وہ بعافیت ہیں۔

اولڈبوائز

۱ ۔ یہ امر ہمارے اور تمام اولڈبوائز کیلئے مسرت خیز و اطمینان بخش ہے کہ ہز اکسلنسی گورنر صاحب بہادر صوبجات متحدہ نے ہمارے برادر مکرم آنریبل نواب صاحب چھتاری کو اپنی ایگزیکٹیو کونسل کا نائب صدر مقرر فرمایا ہے۔ نواب صاحب میں بہت سی ذاتی خوبیاں موجود ہیں، اور اپنے انہیں صفات کی بدولت وہ کونسل کے اندر سوالات کی بارش کا مقابلہ تن دہی گو زندہ دلی کے ساتھ فرماتے ہیں۔ ہمیں حافظ احمد سعید خاں بہادر کی خوبیوں میں سب سے زیادہ انکی یہ بات پسند ہے کہ ماہ مبارک رمضان میں چھتاری جاکر ایک قرآن اپنی مسجد کے مصلیوں کو ضرور سنایا کرتے ہیں۔ اس اعزاز پر ہماری جانب سے نواب صاحب ولی مبارکباد قبول فرمائیں۔

۲ ۔ برادر عزیز خواجہ غلام السیدین صاحب (خلف آنریبل خواجہ غلام الثقلین صاحب مرحوم) اپنے ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں: والد مرحوم کے حالات یقیناً قلمبند کرنا چاہیئے۔ میرا خود عرصہ سے خیال ہے، لیکن اس کے لئے جیسا کہ آپ نے لکھا ہے عم مکرم خواجہ غلام السطبین صاحب کی امداد کی ضرورت ہے وہ آجکل اجمیر میں ہیں، اور میں علیگڈھ میں رہتا ہوں۔ بہرحال میں ان کو لکھتا ہوں کہ وہ یہ کام کردیں۔ امید کہ انشاء اللہ جلد ہو جائیگا، میں بھی کوشش کروں گا کہ "اولڈبوائے" کے لئے کچھ لکھوں"۔ ہم اپنے عزیز بھائی کی توجہ فرمائی کے شکرگزار ہیں، اور ساتھ ہی برادر محترم جناب خواجہ السطبین صاحب کو ان کا وعدہ یاد دلاتے ہیں۔

اس سلسلہ میں ہم اپنے دوسرے بھائیوں سے یہ گزارش کرنا چاہتے ہیں کہ وہ اگر اپنے اُن بھائیوں کی یاد کو تازہ رکھنا چاہتے ہیں، جو ہمیشہ کیلئے جدا ہو چکے ہیں تو براہ کرم اپنے حافظہ پر زور ڈال کر اُن کے حالات قلمبند فرمائیں اور اپنی دماغ سوزی کے نتیجہ کو ہمارے پاس بھیجدیں۔ کیا ہم اپنے مرحوم بھائی مولوی مسنریز مرزا صاحب کے فرزندوں میں سے مسٹر احمد مرزا، مسٹر ابوسعید مرزا اور مسٹر سجاد مرزا سے یہ اُمید کر سکتے ہیں، کہ وہ اپنے باپ کی آخری خدمت انجام دے کر اُن مرحوم کی روح کو شاد، اور ہمیں ممنون فرمائیں گے؟ مسٹر سید محی الدین صاحب سے ہماری درخواست ہے کہ وہ بھی برادرم مولوی عبدالغنی صاحب مرحوم کے حالات ہمارے پاس روانہ فرمادیں۔

۳۔ برادر محترم مولانا شوکت علی صاحب نے تہیہ فرمالیا ہے کہ ماہ مبارک رمضان حیدرآباد میں گزاریں، اور اس غرض سے اوائل ماہ میں وارد بلدہ ہو کر برادرم مولوی محمد اصغر صاحب بیرسٹر کے ساتھ قیام پذیر ہیں۔ جہاں کے بہت سے زنگ خوردہ ولایتی پرزے (یا دیسی ریزے؟) ریزبان کو رشک کی نگاہ سے دیکھ رہے ہیں، اور دلوں کی بات زبانوں پر آچکی ہے کہ اس جواہر ریزے کو کسی تدبیر سے اڑا لیا جائے۔ اگرچہ مولانا کا یہ ورود بالکل پرائیوٹ اور اپنے قدیم دوستوں میں تھوڑی مدت گزارنے کے قصد سے ہے، لیکن ہمیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بیداری میں بھی وہ ارض پاک حجاز پر حجاج کی ضروریات کو ہم پہنچا کر، اُن کے مشکلات کم کرنے کے خواب دیکھا کرتے ہیں۔ صدیاں گزرتی جاتی ہیں، مگر ہمارا انتظام جیسے کا ویسا ہے، اور آفتاب آج بھی ویسی ہی تمازت کے ساتھ لاکھوں بندگان خدا کے سروں پر چمکتا رہتا ہے، جیسا حضرت ابراہیم کے زمانہ میں چمکتا رہتا تھا۔ ہم ہندوستان میں بیٹھ کر عرب کی تیز دھوپ کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ ہم میں اگر تھوڑا احساس بھی اُن مشکلات کا موجود ہے، جو حجاج کو حجاز اور خاص کر منیٰ میں برداشت کرنے پڑتے ہیں، تو اپنے مجاہد نفس کے ذریعہ اس کام کو اتمام تک پہنچانے کی فکر کریں، اور اتنا فنڈ مہیا کردیں کہ وہ دوران حج میں ہندوستانی حاجیوں کیلئے سایہ، پانی، اور دوسرے ضروریات کا اہتمام کرسکیں۔

۴۔ سارے ہندوستان میں حیدرآباد رائفل میٹنگ (Rifle meeting) ہی ایک

ایسی تفریحی پارٹی ہے، جس میں ہندوستانیوں کو بندوق اندازی کا موقعہ ملا کرتا ہے؛ ورنہ ایسی باقی دو پارٹیوں میں تو محض انگریز صاحبان اپنی تفریح کیا کرتے ہیں۔ اس سال جنوری کے آخری دو دنوں سے فروری کے سولہ دنوں تک متذکرہ بالا میٹنگ کی سرگرمیاں زیرصدارت کرنل نواب عثمان یارالدولہ بہادر کمانڈر افواج باقاعدہ سرکار آصفیہ جاری رہیں؛ اور مقابلہ میں زیادہ نمبر پانیوالے افسروں اور سپاہیوں نے، اپنے کمانڈر کے ہاتھ سے ۱۸ فروری کو جام کامیابی اور مقررہ انعامات حاصل کئے۔ اس میٹنگ کی انتظامی کمیٹی میں ہمارے بھائی لفٹنٹ کرنل محمد عظمت اللہ سردار بہادر وایس پریسیڈنٹ؛ اور برادر عزیز کپتان نظیرالاسلام سکرٹری کے سوا سند رجۂ ذیل اولڈبوائز بحیثیت رکن شریک تھے: (۱) لفٹنٹ کرنل مرزا قادر بیگ سردار بہادر (۲) میجر سید ولایت حسین (۳) میجر ریاست علی مرزا (۴) میجر عبدالجبار خاں (۵) میجر عبدالصمد (۶) کپتان محمود حسن خاں (۷) اسکرٹری صاحب افیسرس میس (؟)

برادرم کپتان شیخ محمد بشیر صاحب نے من حیث رکن و پروسٹ مارشل اور حسب ذیل اولڈبوائز نے رینج افیسرس (Range Officers) کی حیثیت سے شرکت کی تھی۔ (۱) لفٹنٹ غلام معین الدین (۲) لفٹنٹ امیر احمد (۳) لفٹنٹ احمد اشرف (۴) لفٹنٹ حبیب احمد (۵) لفٹنٹ خواجہ محمد سعید (۶) سب لفٹنٹ قیصر مرزا بیگ (۷) سب لفٹنٹ محمد عنایت اللہ (۸) سب لفٹنٹ محمد حامد اللہ (۹) سب لفٹنٹ نظام علی بیگ (۱۰) سب لفٹنٹ بشیرالدین احمد (۱۱) سب لفٹنٹ میر امام الدین۔

آخری دن بندوق کی آواز نے ہمیں بھی اپنی طرف متوجہ کیا، اور دل کڑا کرکے، ہم اسکی جانب بڑھے۔ رائفل رینج پر پہونچے تو وہاں کھلنڈری کھلنڈرے نظر آئے۔ غیرفوجی بھائیوں میں سے مولوی سید محمد حسن صاحب بلگرامی اور اُن کے فرزند مسٹر اعظم بلگرامی بھی تماشائیوں میں موجود تھے، دست بکار و دل بیار، کا تجربہ ہمیں اس موقعہ پر اچھی طرح ہوگیا۔ گولیوں کے سایہ میں مجمع اسلام کے ساتھ ہمارا اور سید صاحب کا وقت نہایت ہی لطف کے ساتھ گزرا۔ کپتان میاں محمد بشیر سے بار بار تعارف ہمیں تازہ لطف دیتا تھا۔ دوپہر کو میس ہاوس میں برادر مکرم میجر محمد شفیع اور عزیزی لفٹنٹ سید مسلم علی بلگرامی کو بھی سر جھکائے ہوئے، چھری کانٹے سے جنگ کرتے دیکھا۔ مگر برادران محترم میجر عبدالجبار خاں اور میجر وزیرالزماں خاں کو وہاں بھی آنکھیں ترستی رہیں۔

شام کو خدا حافظ کہنے اور دوستوں سے رخصت ہونے کا وقت آیا تو معلوم ہوا کہ کھلنڈروں میں ایک (اور وہ بھی ہمارے فٹ بال کپتان کی) کمی ہے۔ دریافت کیا تو ایک سپاہی نے کہا کہ میجر صاحب فلسفیوں کی طرح اپنے بنگلہ میں ننگے سر ٹہل رہے ہیں اور کسی سے بات تک نہیں کرتے۔ یہ سنکر سب کو فکر ہوگئی اور خیریت کیلئے بنگلے پر آدمی دوڑائے گئے۔ تھوڑی سی دیر میں راز افشا ہوگیا! اسقدر فکر کی بات یہ تھی کہ انکی گھڑی آتا فوجی کوتوال صاحب کے پنجرا پول (مویشی خانہ) کے معائنہ کو تشریف لے گئی تھیں اور فوجی قاعدہ کی رو سے وہاں روک لی گئیں۔ یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ بعض شوقین سپاہی کوٹ کی جیب میں رکھ کر اس پوتر ہستی کو اپنے گھر لیجانا چاہتے تھے لیکن پیڈنگ کے سکرٹری صاحب کو بروقت اطلاع ہوگئی، اور انھوں نے اس بے زبان کو گھر پہنچکر مالک کو فکر سے نجات دلادی۔

چلتے چلتے ایک بات، کی ہمیں اطلاع لفٹنٹ تاج احمد خاں کے ذریعہ ہوئی! یعنی برادرم نظیر الاسلام صاحب نے ایک نیا وظیفہ شروع کر دیا ہے، اور یہ اسی کا اثر ہے کہ بلدہ میں اب طاعون کمی پر ہے۔ ایسا ہے تو ہم سمجھتے ہیں کہ انھیں اور میاں بشیر صاحب کو میجر بنا کر اسی کام کیلئے مخصوص کر دینا مناسب ہوگا، اور ان دونوں کی معاونت کے لئے خود لفٹنٹ تاج احمد خاں موزوں ہونگے۔

۵۔ اسی فروری میں برادر عزیز لفٹنٹ عمر نواز خاں قلعدار گولکنڈہ کی ہمشیر کی شادی کے موقعہ پر ہمیں اپنے بھائی کے طرز مدارات اور خوش سلیقگی کا اندازہ ہوا۔ یہ شادی ہمارے بھائی مرزا مصطفےٰ بیگ صاحب الکٹریکل انجینیر اورنگ آباد کے ساتھ ۱۷ فروری کو بمقام قلعہ گولکنڈہ واقع ہوئی تھی! جہاں حیدرآباد اور مضافات کی سوسائٹی کے تقریبا تمام شرفاء اور اولڈ بوائز کثیر تعداد میں صف بصف موجود تھے۔ رسم قدیم کے مطابق دولہا کا ایک شہ بالا ہوتا ہے، لیکن ہم جب شادی گاہ میں پہونچے تو ہمیں معلوم ہوا کہ سن شادی کے گرد اگرد بہت سے شہ بالا موجود ہیں! اور لطف یہ ہے کہ دولہا صاحب اپنی جگہ سے غائب دوسرے دوستوں کے پرچانے میں مشغول ہیں۔ ہم نوشاہ اور انکے برادر نسبتی دونوں کو دلی مبارکباد دیتے ہیں۔

۶۔ طاعون کی مصیبت جہاں کہیں آتی ہے اُس حصہ ملک کو زیر و زبر کر دیتی ہے۔ حیدرآباد بھی ایک مدت سے اس بلا کا شکار ہے۔ شائد ہی کوئی سال ایسا گزرتا ہوگا کہ یہاں طاعون نہ آتا، اور اپنی رو میں ہزار ہا جانوں کو

نہ لیجاتا ہو! اس مرتبہ بھی اس بلا نے ادہر کا رُخ کیا، اور برادر مکرم ڈاکٹر حامد علی صاحب نے ہزار کوشش کی لیکن مرض دن بدن بڑہتا ہی گیا، اور شہر کی بیشتر آبادی کو بے خانماں ہونا پڑا۔ ہم بھی کسی سے پیچھے نہ تھے، اور نقل مکان کرنے کے باب میں آسانی کے ساتھ بھائی مولوی سید لیاقت حسین صاحب (علیگ) کے ارشاد کی تعمیل کرنے پر تیار ہوگئے۔ اُن کے ساری گھر سے ہیں جو آرام پہنچا، اسکے لئے ہم اُن کے شکرگزار ہیں۔ ہم صابر میاں صاحب کے بھی ممنون ہیں کہ سماع خانہ درگاہ حضرت شاہ خاموش رح کے بیرونی حصہ کو ہمارے حوالہ فرما دیا تھا۔

۷۔ ہمارے بھائیوں میں سے دو صاحبان کو سرکار آصفیہ کے خدمات سے وظیفہ حاصل ہوا ہے۔ ان میں سے ایک برادرم مسٹر جمیل احمد صدر مہتمم تعمیرات اورنگ آباد دکن ہیں، اور دوسرے برادرم مولوی نظیر حسن فاروقی مہتمم تعلیمات ضلع نظام آباد۔ ہمارے ان بھائیوں نے فرض شناسی کے ساتھ اپنی اپنی خدمت انجام دی ہے، اور ہم خوش ہیں کہ آخر تک اپنی زندہ دلی کو قائم رکھا۔

۸۔ بہرایچ (اودھ) میں ہر سال حضرت سالار مسعود غازی کا عرس ہوتا ہے، اور مختلف دیار و امصار سے ہر طبقہ و مذاق کے کثیر التعداد مرد و زن کا مجمع ہو جاتا ہے، گذشتہ عرس شریف کے اچھے انتظام کا سہرا ہمارے برادر عزیز ڈپٹی محمد عباس خاں صاحب شروانی کے سر ہے، جو مجلس انتظامی درگاہ شریف کے صدر نشین ہیں۔ موصوف کی کمیٹی نے تھوڑے عرصہ سے معاشرتی دلچسپیاں پیدا کرنے کا تہیہ کر لیا ہے، اور سال بسال میلا اور عرس میں رونق زیادہ ہوتی جاتی ہے۔ دنگل کشتی، اور قدیم فن حرب کی نمائش کا سال حال میں اضافہ ہوا ہے۔ ہزاروں زائرین کے منجملہ اس مرتبہ ہمارے برادر مکرم آنریبل نواب صاحب چھتاری نے بھی شرف آستانہ بوسی حاصل کیا تھا۔ ہم مسٹر شروانی کو، اُن کے حسنِ انتظام پر مبارکباد دیتے ہیں، اور زندگی کے ہر مفید شعبہ میں اُن کی کامیابی کی دُعا کرتے ہیں۔

۹۔ کہتے ہیں کہ اِس مرتبہ مسٹر قاسم حسن تھبن سے اور مسٹر سید محمد اعظم بخار سے سخت علیل ہوگئے تھے۔ اولڈ بوائز کے پُرانے مریض، اور معدہ کے قدیم شکار دیا شکاری؟ ہیں۔ اسی لئے ڈاکٹروں کو بڑی جد و جہد سے کام لینا پڑا۔ اور آخر اولڈ بوائز پر بھی معدہ ہی کے افسوں کا اثر پایا جاتا ہے۔ مسٹر غلام پنجتن کہتے ہیں کہ مہینہ میں پانچ پلہ

نمی ہضم کر جانا اغلم چھوڑ دیں تو ابھی اچھے ہو جائیں اور ہم خیال کرتے ہیں کہ مسٹر پنجتن گھمی کی متعلق رائیں زیادتی پر مبنی ہیں۔

۱۰۔ ہمیں یہ معلوم کرکے سخت قلق ہوا کہ برادر عزیز مسٹر تجمل حسین کی شریک راحت و رنج نے ہمیشہ کیلئے اپنا چہرا خاک میں چھپا لیا! اس افسوس میں اسوجہ سے اور بھی زیادتی ہو جاتی ہے کہ مرحومہ وطن سے دور ہنگولی میں بغرض تبدیل مقام قیام پذیر تھیں اور وہیں انکی رحلت واقع ہوئی۔ اپنے بھائی کے اس غم میں ہم اُنکے شریک ہیں اور مرحومہ کیلئے دعاء مغفرت کرتے ہیں۔ مسٹر عبدالغنی نے اس موقعہ پر جس برادرانہ رواداری سے کام لیا ہے، وہ بھی شکرگزاری کے قابل ہے۔

۱۱۔ عزیزی سید صابر حسین پھپوند ضلع اٹاوہ کی ہمشیر کی جوانا مرگی کی اطلاع ہمیں بریلی۔ ان مرحومہ نے اوائل جنوری میں بمقام جالون رحلت کی اور اپنے والدین و اعزہ کو اس وقت داغ مفارقت دیا جب کہ سب لوگ شوال سال حال میں انکی شادی کی تیاریاں کر رہے تھے۔ خداوند عالم مرحومہ کو جوار جناب سیدہ عطا فرمائے اور والدین کو صبر کی توفیق دے۔

۱۲۔ ہمیں یہ معلوم کرکے بڑی خوشی ہوئی کہ برادرم حاجی مولوی سید لطف احمد صاحب کو حال ہی میں ترقی ملی ہے پہلے وہ ناظم صاحب طبابت سرکار آصفیہ کے پرسنل مددگار تھے اور اب ترقی پاکر مددگار ہو گئے ہیں بہت دنوں سے ہمارے برادر عزیز کا وعدہ ہے کہ اولڈ بوائے کیلئے قلم اٹھائیں گے اور حج کی دلچسپیاں سپرد قرطاس کرینگے۔ کیا اچھا ہوا کہ اس موقعہ پر دعوت کے بجائے ہمیں خوشگوار مضمون دیدیں۔ ہم دعوت کی فرمائش کریں تو تصور وار۔ دوسرے بھائیوں کی ذمہ داری ہم نہیں لیتے۔

۱۳۔ رسالہ اولڈ بوائے کی توسیع اشاعت میں ہمارے جن بھائیوں نے کوشش کی ہے اُن کا شکریہ ادا کرنا ہمارے لئے ضروری ہے۔ سب سے پہلے ہم برادر عزیز مسٹر صدیق الزماں (اورنگ آباد دکن) کے ممنون ہیں، جن کا ہفتہ وار یادنامہ ہمیں ضرور ملتا ہے اور اس میں رسالہ کیلئے کوئی نہ کوئی بات ضرور ہوا کرتی ہے۔ ڈائرکٹری کیلئے اولڈ بوائز کے حالات، رسالہ کیلئے اطلاعات کے سوا ہمارے بھائی کی توجہ توسیع اشاعت کی جانب بھی مائل ہے۔ ہم اپنے برادر مہربان کپتان نظیر الاسلام صاحب کے بھی منت پذیر ہیں؛ جنہوں نے عساکر آصفیہ کے علیگڈھی عہدہ داروں کی مکمل فہرست ہمیں عنایت فرمائی اور جو حضرات ہماری پہلی تاخت سے بچ گئے تھے۔ وہ بھی ہمارے ہوتے جاتے ہیں۔

علیگڑھ کا ایک کھلنڈرا

از جناب مولانا شوکت علی صاحب

کہتے ہیں قدیمی جسے، میں یار ہوں تیرا
زلفیں بھی نہ تھیں جب سے گرفتار ہوں تیرا

سید منظر علی صاحب نے اولڈ بوائے حیدرآباد سے پھر نکالا ہے۔ خدا کرے وہ اس کو بہت دن تک زندہ رکھ سکیں۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اولڈ بوائے کے استحکام کی ذمہ داری بھی کسی نہ کسی دن مجھکو لینا پڑیگی؛ تاکہ اسکے ذریعہ سے علیگڑھ کے پُرانے کھلنڈروں اور دوست احباب سے اپنے خاص طریقہ کے مطابق کوئی بڑا کام لے سکوں۔

ہندوستان کی آب وہوا میں، اسلامی تعلیم میں، اُس کے گرد ونواح میں، عجب زہر بھرا ہے، جو ہم سب کو ہی موجودہ حالت پر رضامند رکھتا ہے۔ اولڈ بوائز سے توقع تھی کہ وہ اسلام کے اور بڑے بڑے کام نہ کرتے، ہندوستان کیلئے نمایاں کارگزاریاں نہ کرتے، تو کم از کم اپنی اپیل کو، اور آپس کے پیار ومحبت کو تو قائم رکھتے۔

میں اسلام کا فقیر، بہت سی مشکلات میں پھنسا ہوں۔ ذاتی دشواریاں ہیں۔ کام کی سخت ترین ذمہ داریاں ہیں، مگر پھر بھی خدا کا شکر ہے۔ جب کبھی چار پانچ پُرانے دوست، اور نئے پرانے اولڈ بوائز، خلافت کے دفتر میں میرے چھوٹے سے کمرہ میں، جو میرے سونے کا کمرہ بھی ہے، ڈرائنگ روم اور ملاقات کا کمرہ بھی ہے، دفتر کا

اعجاز محبت منگر، کم کہ در ایں راہ
بے بال و پر از شوق پریدیم پریدیم

کمرہ بھی ہے، نہانے اور وضو کرنے کی جگہہ بھی ہے، وہاں ہم بیٹھتے ہیں، دنیا زمانہ کے قلابے ملاتے ہیں، عظیم الشان سازشیں کرتے ہیں، مگر ساتھ ہی تھوڑی دیر کیلئے دنیا و مافیہا کو بھول کر، اپنی پرانی زندگی کو یاد کرکے، اپنا اور ساتھیوں کا دل خوش کرتے ہیں، گاتے ہیں، ہنستے ہیں، ہنساتے ہیں، چلّاتے ہیں، اور کبھی رو بھی دیتے ہیں۔ ہمارے پیش و پس کیسا ہی جمود، اور قبر کا سا سکوت کیوں نہو، پھر بھی ہم مست کھلنڈرے، اس سے متاثر نہیں ہوتے۔ بہت سے دوستوں سے ایسی مردہ دلی کی باتیں سنتا ہوں، کہ جیل میں یاد کیا ہوا، داغ کا مطلع یاد آجاتا ہے سے

دن گزار اب دل مہجور، باصد آفات کی ساتھ	وہ مزے رات کی، نادان! گئی رات کی ساتھ

شعر خوب ہے، اور سچا ہے، مگر ہم سخت جان، جب مل کر بیٹھتے ہیں، تو خدائے برتر ہمارے دلوں میں وہ خوشی پہنچاتا ہے، کہ تمام گرد و نواح کی مایوسی اور مردہ دلی، دور ہوجاتی ہے۔ اس وقت اسی غزل کا دوسرا شعر ہمارے حسب حال ہوجاتا ہے سے

چار دل بیٹھے جہاں، پھر وہی رنگ در رنگ	کچھ عجب لطف ہے رندوں، قدح خوار کی ساتھ

میں، ایک پرلطف اسلامی میکدہ چھوڑ کر، ماہ مبارک رمضان بسر کرنے، حیدرآباد جیسے اسلامی مرکز میں آیا تھا۔ خیال نہیں بلکہ یقین کامل تھا کہ حضور نظام خلد اللہ ملکہ، مجھ جیسے ..... سے ملاقات کرسکیں گے اور نہ میں، جو انکا دعاگو ہوں، وہ اسلام کے خادم ہیں، اور جو اسلام کے خادم ہیں، میں اُن کا خادم ہوں۔ میں کیوں بیکار اعلیحضرت سے مل کر انکی اور اپنی دشواریوں میں اضافہ کروں؟

حیدرآباد آیا تھا، علیگڈھ کے کھلنڈروں میں آیا تھا، کہ بڑے بڑے لوگ ملاقات کریں یا نہ کریں، یہاں کے ذمہ دار اور بڑے بڑے افسر مہمان نوازی کریں یا نہ کریں، کم از کم علیگڈھ کے دیرینہ چھوٹے اور بڑے اولڈبوائز، جن کی تعداد، حیدرآباد میں ایک ہزار سے اوپر ہوگی، وہ تو مجھ کھلنڈرے کے پاس دوڑتے آئیں گے، اپنی ثقاہت اور وجاہت کو تھوڑی دیر کیلئے بالائے طاق رکھکر، پیدل نہ سہی موٹروں ہی میں سہی، مجھ تک ضرور پہنچیں گے، میرے ہاتھ پاؤں دبائیں گے، خشک و تر دعوتیں کریں گے، نقد نذرانے پیش کر رہے ہونگے، میکدہ سے چھوٹے ہوے کو اگر میکدہ نہیں تو کم از کم سیندھی خانہ تک پہنچائیں گے، اور میں داغ مرحوم کا ایک بہت

اور قانونی کتابیں لیجاؤ، گھر کا سامان قرق کرا کر لیجاؤ، ولایت سے اکسفورڈ کی لائی ہوئی تصویروں کو لیجاؤ، روپیہ پیسہ جو کچھ ہاتھ لگے لیجاؤ، مگر بھائی! دوسرے کے یہاں نہیں جائیں گے۔

تم حیدرآباد کو نہیں جانتے

پیر مغاں کا یہ حال ہے تو میں اوروں کا کیا ذکر کروں!

بیچارہ عظمت اللہ (لفٹننٹ کرنل محمد عظمت اللہ سردار بہادر، کمانڈنگ سکنڈ امپیریل لانسرس) میرے آنے کی خبر پاکر میرے پاس مع اپنی وردی اور تمغوں کے آتا ہے، اور میرے راضی کرنے کے لئے کچھ فلسطین کے دلچسپ حالات بیان کرتا ہے، تھوڑی سی بحث ہندوستان کے معاملات پر کرتا ہے، اور چلا جاتا ہے۔

سیکڑوں اولڈبوائز ہیں، کس کس کا نام لوں۔

ربس مسعود، یعنی نواب مسعود جنگ سے ملا۔ ان حضرت کے پیدا ہوتے وقت میں علیگڈھ میں تھا، بسم اللہ کی جو شیرینی بٹی تھی اس کا بھی دوہرا حصہ لیا تھا۔ روزمرہ دیکھتا تھا کہ دو سفید گھوڑوں کی گاڑی میں سر سید کے ہمراہ ہندوستان کے ساتھ لٹکائے ہوئے یہ جناب نواب مسعود جنگ بہادر بیٹھے ہوتے تھے۔ وہ دن بھی دیکھے ہوئے ہیں، اور دیکھتا ہوں کہ اب وہ آکسفورڈ کے گریجویٹ بنے ہوئے، مجھ سے دو تین انچ اونچے انگریزی اردو میں فرفر باتیں کرتے ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ ایک آدھ بات ایسی بھی کر جاتے ہیں جس سے سید محمود مرحوم کی یاد تازہ کر دیتے ہیں۔ وہی سید محمود جو علم و فضل، لطائف و ظرائف، طبعیات و سائنس کے دریا، اور ہر قسم کی خوبیوں کا دلچسپ مجموعہ تھے۔ مگر جب کام کا ذکر آتا ہے تو میرے کان وہی سنتے ہیں۔

تم حیدرآباد کو نہیں جانتے

قادر بیگ، یعنی لفٹننٹ کرنل مرزا قادر بیگ سردار بہادر، میجر محمد شفیع، میجر عبدالصمد کی زبان پر بھی اسی کا ورد ہے۔

نواب صمد یار جنگ، جو علیگڈھ میں عبدالصمد مظہر کے نام سے پکارے جاتے تھے، اور امجد علی بیگ کی یاد دلاتے تھے، اور میرے سامنے محمد علی کے خوش کرنے کیلئے طرح طرح کے ادھر ادھر سے جمع کئے ہوئے قصے

اپنی حیثیت اور ان میں سننا اپنا فخر سمجھتے تھے، اُن سے بھی ملنے گیا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ میں خدائی خوار، غرض میں سرشار دوپہر کے تین بجے اُنکے بنگلہ پر پہنچا تھا۔ سو رہے تھے۔ جگاتی ہوی ذرا ڈرا کیونکہ

یہ حیدرآباد ہے

اس لیئے اُن سے ملاقات نہو سکی۔ اُن سے بھی جب اِدہر اُدہر کی باتیں کرکے اُنکو خوش کرکے کچھ کام کی باتیں کرتا، تو غالباً وہی آواز کانوں میں آتی کہ

تم حیدرآباد کو نہیں جانتے

چھوٹے بڑے یہاں تک کہ غلام پنجتن کی زبان پر بھی حیدرآباد کا نام زبان پر آجاتا ہے۔ یہ حیدرآباد کیا ہوا، میرے گلے کا جنجال ہو گیا۔ سب آرام طلب عیش پسند مجھے فقرے سناتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ بارہی بار بخارشِ یا ہم باز اس چھوٹے سے دل میں اسقدر آگ بھری ہے کہ حیدرآباد تو ایک اسلامی مرکز ہے، یہاں کے لوگوں میں باوجود کمزوریوں کی بہت کچھ اسلام کا درد ہے، خوبیاں ہیں مٹی اور راکھ میں دبے ہوئے ہیں۔ مگر اسلامی چنگاری اگر زندہ ہے، حیدرآباد کو گرما کر، یہاں کے مسلمانوں کو اللہ کے کاموں کی طرف متوجہ کیا تو کیا بڑا کام کیا۔ قطب شمالی، جہاں ہزاروں میل برف ہی برف ہے، اگر وہاں ایک دل جلا مسلمان اپنے خدائے برتر کے بھروسہ پر پہنچ جائے، اور صدق دل سے ایک آہ لگائے، تو برفستان گھل کر صحیا کو بیزار کردے میں علیگڈھ کا کھلنڈرا کاہل سست عیش و آرام کا چاہنے والا فضول باتوں اور گپوں میں وقت ضائع کرنیوالا، جس کو سوائے کھیل کود ہنسی مذاق کے، دوسرا کام نہ تھا، مگر جب سے اللہ کا سپاہی بننے کی دل میں خواہش ہوی ایک ایسی طاقت پاتا ہوں جو کبھی تو الگ، برف کی سل بھی نہیں پا سکتی۔

داغ مرحوم پر لوگ ہنستے ہیں انکو بڑا شاعر بھی نہیں گنتے، مگر میں بہت کھلنڈرا تو غالب کے بعد انکے کلام میں بہت کچھ لطف اور طاقت پاتا ہوں۔ خوب لکھ گیا ہے ؎

پڑا فلک کو کسی دل جلے سے کام نہیں جلا کے خاک نہ کردوں تو داغ نام نہیں

ہم لوگ بچپن میں ہندوستان میں ٹیسو نکالا کرتے تھے۔ تین سینٹوں کے اوپر ایک صدقی، اس میں ایک چراغ رکھا ہوا۔ اس ٹیسو کو لے کر اپنے عزیزوں کے گھر پہنچتے تھے۔ زبان سے بھی کہتے تھے، اور عمل بھی

اسی پر کرتے تھے کہ "نٹیسوا کر کرے اٹیسو کر کرے اٹیسو لے ہی کے ٹلے"!

کھلنڈرو! علیگڈھ کے کھلنڈرو! ذرا ہوش میں آؤ۔ زمانہ رنگ بدل رہا ہے، دنیا تہ و بالا ہو رہی ہے، ہندوستان نیا رنگ لا رہا ہے۔ تم کو علیگڈھ کے بانی نے اسکی تعلیم دی تھی کہ تمہارے سیدھے ہاتھ میں سائنس و فلسفہ ہے، بائیں ہاتھ میں ریاضی اور دوسرے علوم اور سر پر تاج "کلمہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ" ہو، کیا تم سمجھتے ہو کہ تم اپنی بے حسی، اور جمود سے اپنی مادر کالج اور خود اسلام کیلئے، اگر آج سوتے رہے تو ننگ ملت اور بے حمیت ثابت نہ ہو گے؟ مجھے معلوم ہوا ہے کہ بہت سے تنگ خیال اولڈ بوائز ایسے ہیں کہ اگر ملتے ہیں تو چند خاص دوستوں سے اور پھر بھی اپنے آپ کو اللہ کے خاص چہیتوں کا جتھا خیال کرتے ہیں جن باہمت اور غریب مسلمانوں نے علیگڈھ کی بنا ڈالی تھی، ان کا منشا یہ تھا، کہ ہم میں کا ہر ایک، اسلام کا مجاہد ہو، بلکہ ایک ہاتھ میں علم و عمل کی روشن مشعل ہو، اور تمام دنیا کو اسلام کے نور و صحبت سے منور کر دے۔ مگر۔

او خویشتن گم است کرا رہبری کند

میں حیدر آباد میں سیر تماشے، تفریح، اور سونے کے لئے آیا ہوں۔ انشاء اللہ! میری سیر تفریح بھی عزیز دوستوں کے دلوں میں پھر وہی محبت اور زندگی کی لہر پیدا کر دیگی، اور مسلمان حیدر آباد کے مسلمان، اس سب سے بڑی ہندوستانی ریاست کے مسلمان اس سب سے بڑی اسلامی ریاست کے مسلمان، جن کا بادشاہ ایک فقیر کی زندگی بسر کرتا ہے، کم از کم اولڈ بوائز تو عیش و عشرت اور فضول خرچی و لغویات سے کنارہ کش ہو کر اللہ کے کام کی طرف متوجہ ہوں گے، اپنے خدائے برتر کی دی ہوئی درست عقلی قوت کو اللہ کے دین کی برتری میں صرف کریں گے۔ اسلام کے ایک ادنی غلام، یعنی اپنے آقا اعلحضرت شاہ دکن اور انکی رعایا کی خدمت کر کے دین و دنیا کی فلاح حاصل کریں گے۔

اس جمود کو دور کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے۔ ملک و ملت کی خدمت کرنا، صرف بیگار کے طریقہ سے نہیں حاکم کے ڈر سے نہیں، بلکہ خود دل کی اُمنگ سے کسی کام کو کرنا ہمارا فرض ہونا چاہئے۔ رہا میں تو تم سب خوب جانتے ہو، اب تو سارے ہندوستان کے مسلمان جانتے ہیں، ساری اسلامی دنیا جانتی ہے۔ میں تمہاری کاہل انکاری سے مرعوب ہونیوالا نہیں ہوں۔

جھڑکی سہی، ادا سہی، چین جبیں سہی   یہ سب سہی پر ایک نہیں کی، نہیں سہی

مجھ دیوانے سے بحث نہ کرو، فضول منطقی دلائل سے نہ اپنا وقت ضائع کرو ورنہ میرا اپنی حد کے اندر رکر، جو کچھ کر سکتے ہو، ملک وملت کے لئے کرو۔ خدا اجر دے گا۔ اگر سوتے رہوگے، تو سوائے خواری اور بربادی کے تمہیں کچھ نہ ملے گا۔ مجھے میرے راستہ پر چھوڑ دو۔ کسی نے خوب کہا ہے ؎

نے پیروی قیس، نہ فرہاد کریں گے   ہم طرز جنوں اور ہی ایجاد کریں گے

السعی منی، والاتمام من اللہ! کوشش کرنا ہمارا کام ہے، کامیابی دینا یا نہ دینا اس مالک کی قدرت میں ہے۔

عید تک حیدرآباد میں رہوں گا، اور جانتا ہوں کہ سب نہیں تو بہت بڑی جماعت اولڈبوائز سے مل لینا ممکن ہے۔ مل کر وہ بھی خوش ہوں یا نہوں، مگر ایک تھکا ہوا اسلام کا سپاہی تو ضرور خوش ہوگا۔ خدا حیدرآباد کو "حیدر" آباد رکھے، اور خدا اُسکے بادشاہ کو اسلام و ملک کی خدمت کی اور توفیق عطا فرمائے۔ یاد رکھو کہ تمھاری ساری شیخی، تمھاری ساری عزت، تمھارا سارا چین و آرام اس پر منحصر ہے کہ حیدرآباد "حیدرآباد" رہے، اور اعلیٰحضرت میر عثمان علی خاں بہادر، جن کے نام سے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی کبھی کبھی یاد آجاتی ہے، خدا ان دونوں کو، اور انکے متعلقین کو زندہ و سلامت رکھے، اور ہمیشہ صراط مستقیم پر چلنے کی ہدایت فرمائے۔

تمھارا ایک مست کھلنڈرا

جفا پر جان دیتے ہیں، ستم پر تیرے مرتے ہیں
یہ ناکام محبت، سچ تو یہ ہے، کام کرتے ہیں

ہمیں یہ خبر بہت دیر سے ملی کہ ہمارے غریب الوطن بھائی خاں صاحب احتشام الدولہ خاں صاحب اسسٹنٹ پولٹیکل ایجنٹ کویت و خلیج فارس، متوطن کوٹ ضلع فتح پور ہسوا نے سرطان سے کراچی میں وفات پائی، جہاں مرحوم علاج کی غرض سے لائے گئے تھے۔ مرحوم نے ماتم کرنے کیلئے بی بی بچوں کے سوا ضعیف
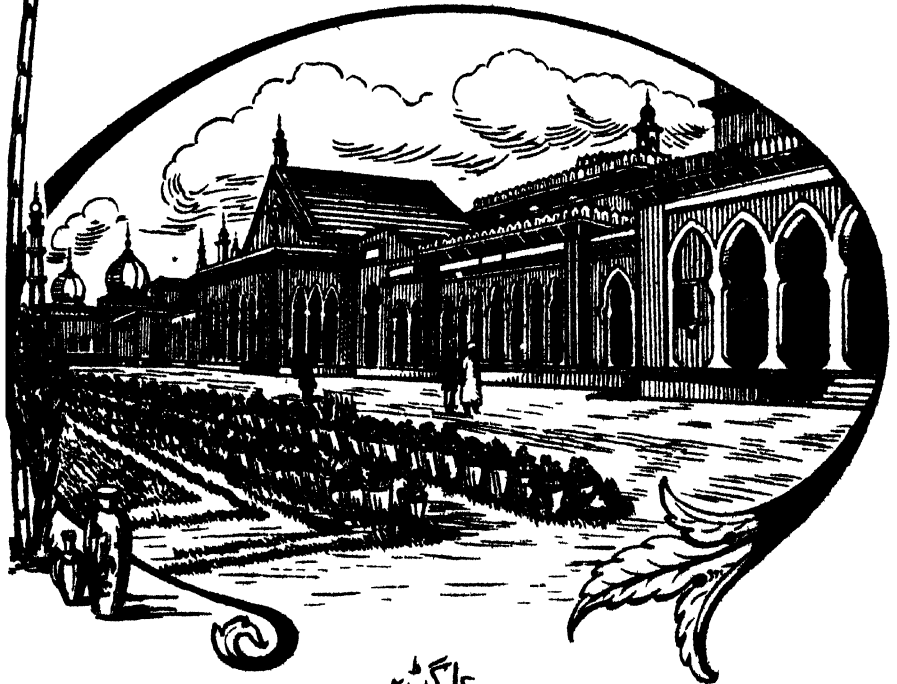
اولڈ بوائے
علی گڈھ

نمبر	مضمون	مضمون نگار	صفحہ
۱۔	رپورٹ سالانہ	جناب مولوی سید سجاد حیدر صاحب بی۔اے	۳
۲۔	فسونکاری (نظم)	״ ״ ״ شبیر حسن خانصاحب جوش	۱۱
۳۔	مطالعہ سوئن برن	״ ״ ״ سید ابوالخیر صاحب مودودی	۱۲
۴۔	شعلۂ ایمانی (نظم)	״ ״ سید سراج الحسن صاحب ترمذی	۲۱
۵۔	شرح دیوان غالب پر ایک نظر	״ ״ سید محمد ضامن صاحب کنتوری	۲۲
۶۔	حقیقت پروانہ (نظم)	"دفینہ"	۲۸
۷۔	اولڈ بوائے کا دور ثالث	جناب مولوی محمد یعقوب صاحب ایم ایل اے	۳۰
۸۔	جلوس کا ہاتھی	"میر مخفی"	۳۳
۹۔	یاد ایام	جناب مولوی محمد عنایت اللہ صاحب بی۔اے	۳۹
۱۰۔	اولڈ بوائز	......	۴۵

سید منظر علی اشہر مدیر و ناشر نے ۴۰۱۲ سلطانپورہ حیدرآباد دکن سے شائع کیا۔

قیمت سالانہ صہ قیمت ششماہی ۔؎

ہمارا کالج

۱۔ نومبر کے آخر ہفتہ میں ہز اکسلنسی سر ولیم میرس نے تھوڑا سا وقت علیگڈھ کے لئے مخصوص، اور ہماری یونیورسٹی کے لئے محفوظ فرما دیا تھا۔ اپنے قیام علیگڈھ کے دوران میں ہز اکسلنسی نے میرس ہوسٹل اور مزمل اللہ ہوسٹل کے سوا مدرسہ کوران کی عمارت کو کشاد فرمایا۔ اس نیک کام کی ابتدا تھوڑا عرصہ ہوا ہمارے برادر محترم صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب نے فرمائی تھی، اور اصل کام کا آغاز حکیم نابینا صاحب دست بینا کی سے ہوا تھا۔ اس مدرسہ کے قیام و بقا کے لئے جن حضرات نے حال میں سعی فرمائی ہے ان میں خود ہز اکسلنسی بھی شریک ہیں۔ چنانچہ اس موقع پر چندہ کی ابتدا خود سر ولیم کی رقم سے ہوئی، اور انہوں نے پندرہ سو روپے اس کار خیر کے لئے عطا فرمائے۔ دوسری بڑی رقموں کے منجملہ نواب سر مزمل اللہ خاں بہادر کے دس ہزار، اور آنریبل نواب صاحب چھتاری کے ایک ہزار شریک ہیں۔

ہز اکسلنسی کے اعزاز میں نواب محمد عبد الصمد خاں بہادر رئیس طالب نگر نے پُر تکلف ڈنر ۲۸ر نومبر کو دیا تھا۔ ڈیڑھ سو کے قریب ہندو مسلمان، اور یوروپین مہمان شریک ضیافت تھے۔ فوجی بینڈ مہمانوں کی سامعہ نوازی میں مصروف تھا۔

نوٹس

ایک اسکالرشپ مبلغ چالیس (۴۰) روپیہ ماہوار کا جو فی الحال ایک سال کے لئے ہوگا اس علیگڈھ اولڈ بوائے کے لڑکے کو جو امتحانی مقابلہ میں اول آوے کسی زراعتی کالج میں تعلیم پانے کی غرض سے دیا جائیگا۔ درخواستیں سید سجاد حیدر بی اے آنریری سکرٹری اولڈ بوائز ایسوسی ایشن مسلم یونیورسٹی علیگڈھ کے پاس ۱۳ر جنوری ۱۹۲۸ء تک آنا چاہئیں

برادر مکرم سید سجاد حیدر صاحب ہمیں یہ خوش خبری سناتے ہیں کہ آنریبل نواب سر مزمل اللہ خاں بہادر کی سعی موفور سے "اولڈ بوائز لاج" کا الحاق "اولڈ بوائز ایسوسی ایشن" واگزار ہو چکا ہے نواب صاحب بہادر اور ایسوسی ایشن کا شکریہ قبول فرمائیں اور مبارکباد بھی کہ حال ہی میں آپ کا انتخاب کونسل آف اسٹیٹ کی رکنیت کے لئے عمل میں آیا ہے۔

جو ۲۶ اکتوبر ۱۹۲۷ء کو جلسہ سالانہ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن علیگڈھ میں پڑھی گئی اور منظور ہوئی۔

برادران کرم! اولڈ بوائز ایسوسی ایشن مسلم یونیورسٹی علی گڈھ ۲۳ اپریل ۱۹۲۸ء کو اپنی زندگی کے پانچ سال ختم کریگی۔ اسکی زندگی گو ابھی مختصر ہے مگر الحمد للہ اسکی داستان خدمت مختصر نہیں۔ اسکی چار سالہ زندگی میں نمائش کا عنصر کم، مگر کام کا حصہ زیادہ ملیگا۔

میں ممبران بیرون علیگڈھ کے ایثار پیہم کا کن الفاظ میں شکریہ ادا کروں۔ حقیقت میں علیگڈھ اولڈ بوائز کی جو علی گڈھ سے دور، دیار بعید میں رہکر، علی گڈھ کی محبت کے شعلہ کو بجھنے نہیں دیتے، میں جسقدر ستائش بھی کروں وہ کم ہے۔ محض اونکی حقیقی محبت والفت علیگڈھ کا ادنے سا کرشمہ تو یہ ہے کہ آجتک ایسوسی ایشن نے تیس۳ بتیس۳۲ ہزار روپیہ جمع کیا جسمیں سے بعد خرچ واخراجات ساڑھے سترہ ہزار روپیہ کی وہ مالک ہے۔ اس روپیہ کے بل بوتہ پر ہم علی گڈھ اولڈ بوائز کی اولاد کو اسکالرشپ اور وظیفے دیرہے ہیں۔ اولڈ بوائز کا یہ خیر جاری خدا رہتی دنیا تک جاری رکھے۔

میں ایجنڈہ کے ساتھ، ایسوسی ایشن کی آمدنی و خرچ کا مفصل گوشوارہ ارسال خدمت کرچکا ہوں یہاں مختصراً عرض کرتا ہوں کہ ۳۱ اگست ۱۹۲۷ء تک ہمارے پاس سترہ ہزار پانچسو چھیاسی روپیہ تیرہ آنہ پانچ پائی ([illegible] ۱۳/ ۵) تھا۔ اسمیں سے بقدر ایکہزار چھ سو چوہتر روپیہ ([illegible]) کے کرایلاج

اور منافع بینک، پرامیسری نوٹ شامل ہے جو من ابتدائے ۱۲ اگست ۱۹۲۲ء تا ۳۱ مئی ۱۹۲۶ء وصول ہوا۔

چار سال میں اس قدر سرمایہ کا جمع ہو جانا اگرچہ بلحاظ تعداد اولڈبوائز کے جو بفضل خدا روز افزوں ہے اور جو سیکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں ہیں حیرت انگیز نہیں، مگر یہ بلحاظ اس عام سرد مہری اور بے توجہی کے جو اولڈ بوائز میں پیدا ہوگئی ہے، طمانیت بخش ضرور ہے۔ لیکن اس مختصر جماعت کا، جو ایسوسی ایشن کی ممبر ہے ولولۂ خدمت و محبت، مساعد و غیر مساعد حالات سے، ذرہ برابر متاثر نہیں ہوتا۔ یہ لوگ بھی عجیب ہیں۔ علی گڑھ کے خلاف پروپگنڈہ، اطراف و اکناف ملک میں پھیلایا گیا، مگر وہ متاثر نہیں ہوئے۔ علی گڑھ نے جب کبھی وہ یہاں آئے اسی کشادہ آغوش سے، انکی پذیرائی نہیں کی جیسی وہ پہلے کیا کرتا تھا، مگر وہ رنجیدہ نہیں ہوئے۔ ان کے حقوق جو پہلے ٹیلیڈ و لی حکمران جماعت نے انہیں دے رکھے تھے، تقریباً سب سلب کر لئے گئے، مگر انکی زبان سے نکلا تو صرف یہ نکلا

> ہم ہوں تو نہیں پروا، رہے محفل باقی
> یا الٰہی یہ چمن تو کبھی برباد نہ ہو

یہاں کی خانہ جنگیاں ان کے لئے باعث ملال ضرور ہوتی ہیں، مگر انہیں یہاں سے بددل نہیں کرتیں۔ وہ اپنی اولاد کو تعلیم کے لئے برابر یہیں بھیج رہے ہیں، جہاں وہ خود تعلیم پا چکے ہیں۔ غرضکہ ان لوگوں نے ماہ بماہ ٹکس ادا کیا، اور تین ہزار آپ کی خدمت میں پیش کر دئے۔ خدا انکی ہمتوں کو بلند رکھے اور انہیں جزائے خیر دے

قواعد میں ترمیم برادران! نومبر ۱۹۲۶ء میں جو سالانہ جلسہ ہوا اس میں ایک عظیم الشان اصول طے ہوا یعنی ایک رزولیوشن پاس ہوا، جس سے صراحتاً ایسوسی ایشن کے سرمایہ میں اپنی برادری کی اولاد کا حق مرجح تسلیم کیا گیا۔ اب گویا یہ اصول طے پا گیا کہ ایسوسی ایشن کے سرمایہ کا معتدبہ حصہ اولڈ بوائز کی اولاد کی تعلیم میں صرف کیا جائے۔

چنانچہ اس رزولیوشن کے پاس ہونے کے بعد، بجٹ میں ایکہزار روپیہ کی رقم منظور کی گئی، اور سنٹرل اسٹینڈنگ کمیٹی نے اسکی تقسیم کیلئے، مندرجہ ذیل قواعد پاس کئے:-

۱۔ چالیس روپیہ ماہوار کا ایک وظیفہ کسی ایسے طالب علم کو دیا جائے جو کسی انجینیرنگ کالج میں تعلیم پاتا ہو۔ (ا) وہ نہ ملے تو کسی میڈیکل کالج والے کو (ب) وہ بھی نہ ملے تو کسی تجارتی کالج والے کو۔ اور (ج) وہ بھی نہ ملے تو بیس بیس روپیہ کے دو وظیفوں میں سے ایک ایم۔ اے کے طالب علم کو اور دوسرا بی۔ اے کے طالب علم کو دیا جائے۔

۲۔ صرف ایسے امیدواروں کو مقابلہ کی اجازت دیجائے جو ایسوسی ایشن کے چندہ دینے والے ارکان کے بیٹے یا پوتے ہوں۔

ان قاعدوں کے ماتحت حسب ذیل اسکالرشپ دے گئے:۔

ایک اسکالرشپ چالیس روپیہ ماہوار کا، خواجہ محمد اسحاق صاحب بی اے (علیگ) تعلیم شکر سازی گلاسکو (انگلینڈ) کو۔ میڈیکل کالج کی تعلیم کیلئے امتحان مقابلہ ہوا۔ اس امتحان میں زید تجمل [illegible] اول آئیں، اور انہیں [illegible] روپیہ ماہوار کا اسکالرشپ، اور آل محمد صاحب کو جو دوم آئے [illegible] روپیہ ماہوار کا اسکالرشپ ملا۔

وظیفے، یعنی وہ مدد جو حاجتمند اولڈبوائز کی اولاد کو دی گئی۔ گذشتہ سال، ایسوسی ایشن نے مرحوم مسعود حسین صاحب (قومی) کی اولاد کے لئے [illegible] ریزولیوشن پاس کیا تھا۔ چنانچہ، انکی اولاد کی تعلیم کے لئے جو بھوپال میں پڑھ رہی ہے، [illegible] روپیہ ماہوار بھیجے جاتے ہیں۔ بچے چھوٹے ہیں، اسلئے یہ رقم ماہ بماہ میجر سعید محمد خاں صاحب ڈائرکٹر سی۔ آئی ڈی بھوپال وممبر ایسوسی ایشن کے پاس بھیجی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ دیہ وظائف دئے گئے ہیں:۔

(۱) زاہد حسین صاحب پسر احمد حسین صاحب مرحوم ہیڈ ماسٹر　[illegible]

(۲) حبیب الرحمٰن صاحب طالبعلم ایم اے۔ ایل ایل بی کلاس　"

(۳) ابوالفضل ہاشمی صاحب　"　"　"　"　[illegible]

(۴) حضور العباس صاحب　"　انٹرمیڈیٹ کلاس　[illegible]

(۵) رفعت خانم صاحبہ　"　زنانہ طبیہ مدرسہ یونانی دہلی　[illegible]

ایسوسی ایشن کی تاریخ میں یہ پہلا موقع ہے کہ لڑکیوں کو اسکالرشپ اور وظیفہ دیا گیا، ورنہ اب تک بیچاری لڑکیاں اسکی مستحق نہ سمجھی جاتی تھیں۔ بے محل نہو گا اگر میں یہاں اپنی ایک دیرینہ آرزو کا ذکر کروں۔ گذشتہ رپورٹ میں میں نے اسکالرشپ و وظائف کے سلسلے میں، عرض کیا تھا۔ "میں کوئی وجہ نہیں سمجھتا کہ اس میں صرف لڑکوں کی تخصیص ہو۔ میں یہ خوب دیکھ رہا ہوں کہ ہماری لڑکیاں بھی، ایسوسی ایشن سے اسکالرشپ لے کر مصر و قسطنطنیہ کے لیڈیز کالج میں تعلیم پائیں گی۔" چنانچہ اس سال پہلا قدم اٹھایا گیا ہے؛ یعنے ایک رزولیشن آپ کی منظوری کیلئے پیش کیا جائیگا، جس کا مقصد یہ ہے کہ عربی اور انگریزی کی اعلیٰ تعلیم کیلئے ۶۰؎ ماہوار کا ایک اسکالرشپ مقرر کیا جاوے۔ یہ اسکالرشپ کسی اولڈبوائے کی اُس لڑکی کی تعلیم پر صرف ہو؛ جو مصر کے کسی زنانہ کالج میں جاکر تعلیم حاصل کرے۔ ممالک اسلامیہ میں جاکر تعلیم حاصل کرنا، ایک ایسا خیال ہے جو مجھے اُمید ہے کہ آپ کو ضرور پسند ہوگا۔ ہم اپنے لڑکوں کو وہاں اسلئے نہیں بھیج سکتے کہ وہاں کی ڈگریوں کو، حکومت ہندوستان قبول نہیں کرتی، اور کشمکش حیات میں، کسب معشیت کا یہ پہلو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ مگر بحمداللہ ہم ابھی تک اقتصادی مجبوری کے اُس درجے تک نہیں پہونچے (گو میرا خیال ہے کہ وہ درجہ بھی جلد آنیوالا ہے) کہ ہمیں اپنی لڑکیوں کی تعلیم کے وقت یہ سوچنا پڑے گا کہ وہ تعلیم حاصل کرنے کے بعد، کہاں نوکری کرسکیں گی۔

جو وظائف دئے گئے یا دئے جارہے ہیں، وہ ہمیں کسطرح واپس ملیں؟ یہ ایک بڑا اہم سوال ہے۔ مجھے علم ہے کہ ہماری یونیورسٹی نے ایک لاکھ کے قریب روپیہ ولایت میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے، طلبہ کو دیا۔ یہ طلبہ، نمایاں کامیابی کے بعد ہندوستان لوٹے اور معزز عہدوں، اور بڑے بڑے مشاہروں پر فائز ہیں۔ لیکن ان میں سے بیشتر نے یونیورسٹی کو وہ روپیہ جو اُس نے انہیں قرض دیا تھا واپس نہیں کیا۔

کیا ہمارا بھی یہی حشر ہونا ہے؟ اُمید ہے کہ ایسا نہو گا۔ اسلئے کہ ہمارے ایک طالبعلم، محمد حسین خان صاحب جو اسوقت ایک جلیل عہدے کے فرائض انجام دیرہے ہیں، بلا طلب، اُس تمام اسکالرشپ کو ادا کر رہے ہیں؛ جو انھیں دیا گیا تھا۔ وہ ماہانہ پچاس روپیہ کی معقول رقم دیرہے ہیں؛ اور اُسکے علاوہ ایسوسی ایشن کی

ممبری کا چندہ باقاعدہ طور پر بھیجتے ہیں۔ خدا اُن کے مدارج میں روز افزوں ترقی کرے۔

مگر ایک اور صاحب ہیں، جو معقول تنخواہ پا رہے ہیں۔ آپسے بھی اعادۂ قرض حسنہ کا مطالبہ کیا گیا، اور انکی خدمت میں حساب بھیجا گیا۔ ارشاد ہوا حساب غلط ہی، یہ ہونا چاہئے۔ عرض کیا گیا بہتر جو رقم آپ فرماتے ہیں، وہی صحیح ہے، وہی عنایت ہو۔ اُنکے جواب میں خاموشی ہے۔

حکایت تغافل و اہمال

برادران! اب میں آپ کے پکے پھوڑے کو چھیڑنا چاہتا ہوں، یعنی اولڈبوائز لاج کے متعلق عرض کرنا چاہتا ہوں۔ یہ تغافل و اہمال کی داستان ایسی دلدوز داستان ہے، جو ختم ہی ہونے میں نہیں آتی۔ لاج ہم سے کس طرح چھنا، اولڈبوائز اُس سے کس طرح بیدخل ہوئے، یہ سب کو معلوم ہے، اور اسکا ذکر دلخراش کن نہیں، اسکی واپسی کے متعلق جو کوششیں کی گئیں انھیں آپ کی خدمت میں بیان کرنا چاہتا ہوں۔

برادر محترم صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب جب وائس چانسلر ہوئے، اولڈبوائز کے کئی ڈیپوٹیشن اُن کے پاس گئے۔ انہوں نے ارشاد فرمایا کہ زمام کار اپنے ہاتھ میں لینے کے بعد میں اس مسئلہ پر غور کرونگا۔ پورا ۱۹۲۴ء اور ۱۹۲۵ء کے گیارہ مہینے اُمید و انتظار میں ختم ہوگئے۔ ۱۹۲۵ء کے آخر میں نواب سر مزمل اللہ خاں بہادر نے خط آزادی ہمیں مرحمت کیا، اور لاج واگذار ہوا۔ مگر اس حکم میں یہ درج تھا کہ لاج Lease پر ایسوسی ایشن کو دیا جاتا ہے۔ مالک مکان اجارہ دار قرار پایا۔ اسکے بعد ۵ و ۶ نومبر ۱۹۲۶ء کے سالانہ اجلاس میں مندرجہ ذیل رزولیوشن پاس ہوا۔

"اولڈبوائز لاج کو کامل طور پر واپس لیا جائے، اور اس غرض کی تکمیل کے لئے ایک کمیٹی بنائی جائے"

چنانچہ ۱۸ فروری کو ایک ڈیپوٹیشن اولڈبوائز کا نواب صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا، اور اُس نے ایک ایڈریس[1] پیش کیا جس میں عرض کیا گیا تھا۔ "یہ حضور کے فیصلہ ہی کا طفیل ہے کہ اولڈبوائز لاج،

---

[1] یہ ایڈریس منجانب ایسوسی ایشن مسٹر احسان الحق، خان بہادر مرزا قسیم بیگ چغتائی، مسٹر خلیل احمد مراد، مسٹر خواجہ عبدالعلی، مسٹر عبدالرب، اور مسٹر سید سجاد حیدر نے پیش کیا تھا۔ ایڈیٹر

پھر اولڈ بوائز کا مستقر ہے، اور بشرائط مسلم یونیورسٹی ایسوسی ایشن کے تحت تصرف میں ہے۔ لیکن حضور کے حکم میں ایک لفظ Lease کا ایسا ہے، جس نے ایسوسی ایشن کو متاجرانہ حیثیت دے رکھی ہے۔ ہم بکمال ادب حضور والا کی خدمت میں استدعا کرتے ہیں کہ متاجری کی قید و شرط اٹھا دی جائے، اور مسلم یونیورسٹی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن، عمارت اولڈ بوائز لاج کی مالک قرار دیجائے۔

حضور والا! اس ایسوسی ایشن کے قواعد و ضوابط میں یہ داخل ہے کہ ایسوسی ایشن یونیورسٹی کے تمام قوانین و قواعد کی جو اُسپر اور ممبران پر عاید ہوتے ہوں پابندی کریگی، اور ہمیں یقین واثق ہے کہ انشاء اللہ ایسا موقع پیش نہ آئیگا جب کہ ایسوسی ایشن، اپنی آزادی رائے اور آزادی عمل کو برقرار رکھتے ہوئے، قوانین مجریہ، و احکامات حکام مجاز یونیورسٹی کی تعمیل سے سرتابی کرے۔ لیکن اگر کسی وقت احیاناً یونیورسٹی کسی شدید ضرورت کی بناء پر، عمارت لاج پر قبضہ کرنا چاہے تو ہم چاہتے ہیں کہ یہ فیصلہ اس وقت قرار پا جائے کہ مسلم یونیورسٹی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کو عمارت کی واقعی لاگت، یا اسوقت کی قیمت جو مقدار میں زیادہ ہو، ایسوسی ایشن کو یونیورسٹی ادا کر دے۔ ایسوسی ایشن بلا کسی عذر کے اولڈ بوائز لاج کی عمارت کو یونیورسٹی کے قبضہ و ملکیت میں دیدے گی۔"

نواب صاحب نے وعدہ فرمایا کہ وہ اس معاملہ کو معہ اپنی زبردست اور وقیع سفارش کے اگزیکٹو کونسل کے سامنے پیش کر دیں گے۔ اور مجھسے ارشاد فرمایا کہ میں ایسوسی ایشن کی طرف سے ایک درخواست گزرانوں۔ چنانچہ میں نے ۱۱ اپریل ۱۹۲۷ء کو یہ درخواست پیش کی۔ مگر نہ معلوم یہ درخواست کس منحوس ساعت میں لکھی گئی تھی، کہ کونسل نے اب تک اسکے متعلق کوئی فیصلہ نہیں کیا۔

برادران! میں نے درخواست میں ذکر کیا تھا، اور گذشتہ سال اپنی رپورٹ میں بالتفصیل عرض کیا تھا، کہ Lease کی وجہ سے، سارا مسئلہ، حالت عطالت میں پڑا ہوا ہے، اور معاملہ اس مرحلہ پر آکر رک گیا ہے؛ جہاں سے بغیر ایک قطعی فیصلہ کے آگے بڑھنا ناممکن ہے۔ میں نے گذشتہ رپورٹ میں عرض کیا تھا۔

"آپ ذرا موجودہ صورت حالات پر غور فرمائیں۔ لاج دو منزلہ عمارت کی شکل میں مکمل

کئے جانے کے ارادہ سے تیار کیا گیا تھا۔ اوپر کی منزل ابھی بالکل نہیں بنی۔ اسوقت یونیورسٹی کے ممبران اسٹاف کے رہنے کے لئے مکانات کی سخت ضرورت ہے، لاج ایک ایسی عمارت ہے اور ایسے موقع پر واقع ہوئی ہے کہ غیر متاہل پروفیسر یا وہ جو تنہا رہتے ہوں اسمیں کمرے لیکر رہنا بہت پسند کرتے ہیں۔ اوپر کی منزل میں اگر چار کمرے رہنے کیلئے بنا دئے جائیں تو کم سے کم اسٹاف کے چار ممبروں کیلئے جگہ نکل آئے، اور اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کو کرایہ کی معقول آمدنی ہو۔ مثلاً اس وقت دو کمروں کا کرایہ چالیس روپیہ آتا ہے، اگر اوپر کے درجہ کے چاروں کمرے تیار ہو جائیں تو اسی روپیہ ماہوار اوپر کی منزل سے ملے۔ اس طرح ایک سو بیس روپیہ ماہوار کی مستقل آمدنی محض کرایہ سے ایسوسی ایشن کی ہو جائے۔ اور کئی پروفیسر جو (معاف کیجئے گا اگر میں کہوں) اسوقت بے خانماں و بے سروساماں پھرتے ہیں، آسودگی و راحت کے ساتھ مستقر پا جائیں۔ آپ کی ایسوسی ایشن کی بحمد للہ مالی حالت اب ایسی ہے کہ وہ لاج کی دوسری منزل بہت آسانی سے بنا سکتی ہے۔ لیکن جب تک کہ Lease کی تلوار ہمارے سروں پر لٹک رہی ہے، کم سے کم میں تو اس پر راضی نہ ہونگا، کہ ہماری ایسوسی ایشن کا ایک پیسہ بھی اس عمارت پر صرف کیا جائے؛ جس سے نہ معلوم کس وقت اور کس بنا پر ہم نکال دئے جائیں، اور جس میں صراحتاً ہمیں کسی قسم کا حق ملکیت نہیں ہے۔ لیکن یونیورسٹی کی ضروریات پر نظر کرتے ہوئے میں بادلِ ناخواستہ ایک بات پر راضی ہو سکتا ہوں، اور وہ یہ کہ مجوزہ بالائی منزل ہم بنا دیں، لیکن اگر کسی وقت یونیورسٹی اس عمارت پر قابض ہو تو ہمارے بنائے ہوئے حصہ کی قیمت جو اُس وقت ہو یونیورسٹی ہمیں دے؛ بشرطیکہ یہ قیمت کسی حال میں اس سے کم بھی نہ ہو جو ہم نے اُس عمارت پر صرف کی ہو۔ اور اگر اُس وقت قیمت، لگائی ہوئی لاگت سے زیادہ ہو تو اسکے بھی ہم ہی مستحق ہوں گے۔ شاید یہ خیال کیا جائے کہ اسمیں تو ہر صورت میں اپنا فائدہ ہی سوچا گیا ہے۔ جواباً میں عرض کرونگا، کہ بیدخلی ایک ایسا تشدد ہے کہ جسے بیدخل ہونیوالا ٹھنڈے دل سے قبول نہیں کرتا، اور اسکی اشک شوئی کیلئے بیدخل کنندہ معقول معاوضہ دیتا ہے۔ معلوم نہیں آپ حضرات کی کیا رائے ہے، اگر فروائے قیامت ہی کے لئے فیصلہ معلق رکھا گیا، تو لاج کی بالائی منزل نہ معلوم کب بنے، یا بنے بھی کہ نہیں! مجھ سے چند قانون داں

بھائیوں نے فرمایا تھا کہ Lease کا لفظ اس قدر خوفناک نہیں ہے جتنا تم اُسے سمجھے ہوئے ہو، اسلئے کہ Lease میں یہ شرط نہیں ہے کہ ایسوسی ایشن بطور کرایہ لاج کے کوئی رقم یونیورسٹی کو دیگی! اور جب کرایہ درج نہیں تو بغیر کرایہ کے Lease نہیں ہو سکتی۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ قانون کی یہ شرح، جو مجھ سے بیان کیگئی ہے، وہ کہاں تک صحیح ہے۔ میری رائے تو یہ ہے کہ قانون داں بھائیوں کی ایک کمیٹی اس مسئلہ پر غور کرکے، اور موجودہ پیچیدگی کو مدنظر رکھ کے، کوئی فیصلہ کردے، اور مجھے ہدایت کردے کہ آیا منزل بالائی، موجودہ حالت میں بنادی جائے یا نہیں؟

برادران! مثل سال گذشتہ کے میں پھر آپ کی خدمت میں عرض کرتا ہوں، کہ یونیورسٹی کورٹ میں آپ کو اپنے نمائندے بھیجنے کا کوئی حق نہیں۔ ضمناً، آپ رجسٹرڈ گریجویٹس کو ووٹ بشرطیکہ آپ بھی گریجویٹ ہوں دیسکتے ہیں۔ محض بہ حیثیت اولڈ بوائے، آپ کو اتنا بھی حق نہیں! جو ایجوکیشنل کانفرنس کے ہر ممبر کو ہے۔ وہ پانچ روپیہ فیس دیکر، سنٹرل اسٹینڈنگ کمیٹی میں منتخب ہو سکتا ہے! اور وہاں سے یونیورسٹی کورٹ میں پہونچ سکتا ہے۔ آپ پر ہمیشہ کے لئے کورٹ کا دروازہ بند ہے۔ میری رائے ہے! کہ یونیورسٹی ایکٹ میں حقوق اولڈ بوائز سے چشم پوشی کیگئی ہے، اور اب کہ قانون پر نظر ثانی کیجارہی ہے، وقت ہے کہ آپ بھی اپنے نقطۂ نظر کو پوری قوت کے ساتھ کار فرمایان یونیورسٹی کے سامنے پیش کریں۔

برادرانِ مکرم! فضا مکدر ہے، صف آرائیاں ہورہی ہیں، اس محبوب، اس عزیز درسگاہ پر سخت وقت گذر رہا ہے۔ آپ ہر نازک وقت، ہر نازک موقع پر چاروں طرف سے دوڑکر، اسکی حمایت و حفاظت کو آئے ہیں اور حصن حصین بنکر اُسکے گرد کھڑے ہوگئے ہیں، اور اُسے گزند پہونچنے نہیں دیا۔ اشخاص سے ہمیں کوئی غرض نہیں مگر اسکی بہبودی ہمیں جان سے زیادہ عزیز ہے، اور میں یقیناً آپ کی دلی جذبات کی ترجمانی کرتا ہوں جب میں پکار کر کہتا ہوں

جو عدوئے باغ ہو برباد ہو ۔۔۔ اہیں یا گلچیں ہو، یا صیاد ہو

خاکسار .... سید سجاد حیدر

فسوں کاری

از جناب جوشؔ ملیح آبادی

اے دورِ ہوس پرور! اے عہدِ ریاکاری!!
کیا شرع میں تیری بھی جائز نہیں میخواری؟

میرے دلِ نازک میں کیوں دست و گریباں ہے
اے عشق کی بیتابی! اے عقل کی خودداری!!

گفتار میں آ اُس کو آئینِ جنوں سمجھا
اے عشق! سنا تو نے کیا کہتی ہے ہشیاری؟

اس بزم میں سوچو تو کیا نیند کے معنی ہیں
جس عالمِ غفلت میں اک خواب ہے بیداری

آرام طلب دل پر، احساسِ غلامی سے
اک ضرب لگا کاری، اک زخم لگا کاری

یہ عیش کی صورت ہے، وہ لطف کا ساماں ہے
اے عقل! کھلونوں کی تا چند خریداری!

کس حد کی جنوں پرور شرطیں ہیں محبت کی
خاموشی و گویائی، بدمستی و ہشیاری

پردہ اب اٹھایا ہے، لیلائے محبت نے
کاندھے پہ مرے رکھ دو تابوتِ ہوسکاری

اے شرمِ گنہ! تجھ سے بیکار الجھتا ہے
یارانِ طریقت کا پندارِ نکوکاری

ملتے ہی نظر اُن سے، ہنسنا تو کجا، ہمدم!
میں رو نہ سکا دل پر، عالم وہ ہوا طاری

معبود! طلب کر لے قدرت کے مناظر کو
کافر ہوں اگر خود سے کی ہو کبھی میخواری

اندھوں کو دکھا جلوے، بہروں کو سنا نغمے
قدرت نے مرے حق میں، یہ حکم کیا جاری

میری ہی نگاہوں نے اے جوشؔ! سکھائی ہے
اس جانِ تمنا کی آنکھوں کو فسوں کاری

SWINBURNE

مطالعۂ سوئن برن

دورِ حاضر کے ایک اچھے نقاد نے لکھا ہے: شیلی Shelley اور سوئن برن کی مشابہت ہمیں اس حیرانگیز خیال کی طرف اکساتی ہے کہ شیلی نے سوئن برن کی صورت میں نیا جنم لیا ہے، اور یہ واقعی اس ڈوبے ہوئے شاعر کی رُوح ہے، جو دوبارہ زندہ ہو کر آکسفورڈ یونیورسٹی Oxford University میں اپنی وہ تعلیم مکمل کرنے آئی ہے، جس کا سلسلہ اسے اس صدی کے آغاز میں کالج سے نکالدئے جانے کی وجہ سے منقطع ہو گیا تھا۔ یہ خوشنما خیال چند عجیب مشابہتوں کی طرف ہماری رہنمائی کرتا ہے: سوئن برن صرف اسی ایک بات میں شیلی سے مشابہت نہیں رکھتا کہ وہ اسی طرح ایک اچھے خاندان میں پیدا ہوا، اور پھر اسکی زندگی کا ابتدائی زمانہ ایٹن Eton کے مدرسے میں اسی انتہاپسندانہ جوش کے ساتھ گذرا، جس انتہاپسندانہ جوش کے ساتھ شیلی کا زمانہ گذرا تھا۔ بلکہ وہ اس بات میں بھی شیلی سے پوری مشابہت رکھتا ہے کہ اس کی آواز بھی عیسائیت اور سماجی رسوم Conventions کی مخالفت میں اتنی ہی بلند ہے جتنی بلند شیلی کی آواز تھی۔ اور جس طرح وہ ہر بات کا ایک دم فیصلہ کر لیا کرتا تھا، اسی طرح یہ بھی چھوٹتے ہی جو رائے قائم کر لیتا ہے اسی پر جما رہتا ہے۔ ممکن تھا اس صدی کے آغاز میں اسکے ساتھ بھی وہی سلوک کیا جاتا جو بائی رن Byron اور شیلی کے ساتھ کیا گیا تھا۔ لیکن زمانہ بدل چکا تھا، پبلک وسیع الخیال اور فہیدہ ہو گئی تھی، اور نقادوں نے ایک زبان تسلیم کر لیا تھا کہ: سوئن برن انگریزی ادب کا بہت بڑا ناظم Verse Writer ہے اگر زندگی میں پوری طرح

قدر نہ کی گئی تو مرنے کے بعد ضرور کیجائے گی۔ اس لئے وہ اس سلوک سے بچا رہا جو اسکے ہم سیرت شیلی کے ساتھ کیا گیا تھا۔

اگر یہ واقعہ ہے یعنی فی الحقیقت شیلی نے سوُن بَرن کی صورت میں دوبارہ جنم لیا ہی، تو ہمیں ماننا چاہئے کہ اس نے اپنی اس دوسری زندگی میں پہلی زندگی کے تجربات سے بہت کچھ مفید ذہانت حاصل کرلی ہے۔ وہ یقیناً پہلے سے بہت زیادہ اچھا اور مضبوط کیرکٹر رکھتا ہے، اس نے اپنے انتہا پسندانہ خیالات و جذبات صرف نظم کی حد تک محدود رکھے ہیں، اور وہ گھریلو زندگی میں بھی اپنے چال چلن سے سماجی رسوم کی مخالفت نہیں کرتا۔

شاعری میں اس کا درجہ شیلی سے بہت بڑا ہے، اور ٹینی سَن Tennyson روزے ٹی Rossetti اور براؤننگ Browning بھی اسکی برابری نہیں کرسکتے۔ بلکہ کوئی انگریز شاعر، یہاں تک کہ ملٹن Milton بھی نظم کی استادی میں اس کا ہم پلہ نہیں ہے۔ مجھے صاف لفظوں میں کہنا چاہئے کہ وہ یورپ کے تمام شعرا میں ایک بڑا شاعر ہے، کیونکہ وہ انگریزی، فرنچ، یونانی، اور لاطینی زبانوں میں شعر کہنے کی یکساں اور اعلیٰ مہارت رکھتا ہے یہی وجہ ہے کہ انگلستان کے تمام شعرا بھی اسکے آگے نیاز مندانہ سر جھکاتے ہیں۔

شاعری کی طرح تمثیل Drama نگاری میں بھی اس کا درجہ بہت بلند ہے، اور وہ انگریزی کے تمام زندہ تمثیل نگاروں میں سب سے بڑھا ہوا ہے۔ میں پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ انیسویں صدی کے تمثیل نگاروں میں ایک بھی ایسا نہیں ہے جو اس کی ہمسری کرسکے۔ اٹھارویں صدی کے بہترین ڈراموں میں صرف ایک ہی ایسا ڈراما ہے جو شاید اس کے ڈراموں کے پہلو بہ پہلو رکھا جاسکے، اور وہ شیلی کا "سن سی" Cenci ہے۔ لیکن اس کے "پرومتھیہ یونان بلونڈ" Prometheus Unbound کے مقابلے میں سوُن بَرن کا یونانی حزنیہ "اٹ لانٹا ان کیلیڈان" Atalanta in Calydon بہت کچھ سبقت لے گیا ہے۔

سوُن بَرن کی خداداد قابلیتوں کی ایک اور خصوصیت اس کی تنقیدی قابلیت ہے۔ وہ ایک بڑا

نقاد ہے ؛ ایسا بڑا نقاد کہ اس کے انتقاد سے اسکے مخالف ہمیشہ خائف رہتے ہیں ۔ اسی کے ساتھ وہ بڑا جوہر شناس ہے، اور اسی چیز نے اسے ان لائق نوجوانوں کی مدد پر آمادہ کیا جو منظر عام پر آنے کے لئے کسی نمایاں شخصیت کی دستگیری کی محتاج تھے ۔ اس نے ان کے نتائج افکار پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھے، اور ان کی واجبی قدر افزائی کی۔ ان باتوں سے تم اسکی زبردست قوتوں کا اندازہ کر سکتے ہو۔

وہ ۱۸۳۷ء میں پیدا ہوا تھا، یونیورسٹی کی زندگی اختیار کرنے کے ساتھ ہی اس نے شاعری میں قدم رکھا، اسوقت سے ابتک اسکی شاعری کا سلسلہ جاری ہے، اور اب اس کا کلام مقدار میں اس صدی کے شاید کسی بڑے شاعر سے بھی بڑھ گیا ہے ۔

اگر یہ حقیقت ہے کہ سوئن برن کے بھیس میں شیلی نے دوسرا جنم لیا ہے ؛ تو یہ بھی حقیقت ہے کہ پہلے وہ بچہ تھا اور اب دیو ہو گیا ہے ۔

میرے ان الفاظ نے شاید تمھیں حیرت میں ڈالدیا ہو گا لیکن اس سے میرا مقصد اس خاص امتیاز کا اظہار ہے جو نظم و نثر میں وزن و قافیے اور ترنم کی وجہ سے ہوتا ہے۔ بڑا شاعر Poet کہنے سے میرا مطلب نظم کا بڑا استاد Master of Verse ہے۔ اگر تم مجھ سے یہ پوچھو گے کہ: کیا سوئن برن اخلاقی اور فلسفیانہ مطالب میں بھی ٹینی سن، روزے ٹی اور براوننگ سے بڑا ہے ؟ تو میں کہوں گا کہ نہیں ۔ وہ بڑا ہے صرف علم و فضل، کثرتِ الفاظ اور خوبی کے ساتھ ان کے استعمال کرنے میں ۔ اور چھوٹا ہے، اعلیٰ جذبات اخلاقی اور فلسفیانہ مضامین اور ہم احساسی کیفیات کے اظہار میں ؛ جن سے شاعری میں دل فریبی پیدا ہوتی ہے، اور جس کی وجہ سے اس سے ایسے لوگ بھی لطف اندوز ہو سکتے ہیں جنہیں صناعت لفظی Art of Words سے سروکار نہیں ہوتا۔ اس حیثیت سے سوئن برن تمام وکٹورین Victorian شعرا میں بہت کم دلچسپ ہے ۔ یہ غیر معمولی امتیازی قوت صرف انگریزی ادب کے مطالعے ہی سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ اس کے لئے کلاسی کل Classical مطالعہ بھی ضروری ہے جس سے ادبی اظہار خیال کی اعلیٰ ترکیبوں کو سمجھنے کی قابلیت پیدا ہوتی ہے ۔ سوئن برن کے ہاں یہ چیز بہت زیادہ ہے اور عام طور پر اس کے سمجھے جانے میں یہی ایک بڑی روک ہے ۔ جو لوگ عالم نہیں ہیں اور ادب کے

ہر شعبہ پر ہمہ گیر نظر نہیں رکھتے وہ اس کے مطالب پوری طرح نہیں سمجھ سکتے۔ میں سمجھتا ہوں اصنافِ سخن میں ملٹن کی طرح وہ بھی بہت کم مفید نمونے پیش کرسکتا ہے، اور خیالات و جذبات کے پہلو سے اسکا کلام ملٹن سے بھی کم قیمت ہے۔

شاعری کے مطالعے کے چند طریقے ہیں، عوام کی بڑی تعداد جو شعراء کی کتابیں خریدتی اور پڑھکے لذت پاتی ہے، عروضی مباحث سے عموماً بےخبر ہوتی ہے۔ ایک لاکھ سے زیادہ انگریز جو ٹے نی سن کا مطالعہ کرتے ہیں، مجھے شبہ ہے کہ ان میں سے ایک ہزار بھی اس کا آرٹ پوری طرح سمجھتے ہوں۔ البتہ شاید انگریزی یونیورسٹی کے ادبی نصاب لینے والے طلبہ اس کے فن کے محاسن جانتے ہوں۔ لیکن شعراء کی دولت و شہرت علماء سے نہیں، بلکہ بڑی بڑی نیم تعلیم یافتہ جماعتوں سے ہوتی ہے، جو انہیں جوش، جذبات، اور تخیل کے لئے پڑھتی ہیں، اور وہ انہیں لذت کے ساتھ تشنگی سے بھی لب ریز کر دیتا ہے، اور ان کے خیالات میں روشنی اور انکی عادتوں میں اصلاح پیدا کرتا ہے۔ اس کے لئے عوام کو شاعر کا طریق کار جاننے کی ضرورت نہیں ہے، صرف نتائج سمجھ لینے ہی کافی ہیں۔ یورپ کے شعرا ان معنوں میں وہاں کی آبادیوں کے معلم ہیں۔ یہ شاعری کے مطالعے کا عام طریقہ ہے۔

دوسرا طریقہ عالمانہ اور ناقدانہ ہے۔ لیکن اس سے میرا مطلب فلسفیانہ طریقہ نہیں ہے۔ یہ بات ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ ہم ایک شاعر کا پوری توجہ سے مطالعہ کرتے ہیں: قافیے کی بندش؛ اور ترکیب کی چستی جانچتے ہیں، اسکے حسین فقروں، اچھوتے لفظوں، نئی باتوں، اور اندازِ بیان کے دلکش اسلوبوں سے مزے لیتے ہیں؛ اور وہ الفاظ کے صورت و رنگ کی آمیزش سے جو نئے نمونے پیش کرتا ہے، ان کو چنتے ہیں۔ لیکن اس طرح کسی شاعر کا مطالعہ کرنے کی صلاحیت بہت کچھ ہمارے ادبی رجحان اور تعلیمی مواقع پر منحصر ہے۔

پہلے طریقے کی نسبت مجھے شبہ ہے کہ تم سوئن برن کے ہاں کچھ نہ پاسکوگے۔ وہ شیلی کیطرح مطالب سے اکثر خالی ہوجاتا ہے۔ لیکن دوسرے طریقے کی نسبت میں کہہ سکتا ہوں کہ ہم اسکے بہترین کلام میں سے بہت کچھ منتخب کرسکتے ہیں۔ اسی کے ساتھ مجھے صاف طور پر یہ بھی کہہ دینا چاہئے کہ آگے چل کر

تمھیں مایوسی نہو کہ تم اُس کے ہاں وہ حسین اور موہنے خیالات نہ پا سکوگے جو روزے ٹی، ٹینی سن، اور براؤننگ کے ہاں پاتے ہو ؛ جوان جان طور پر دلوں میں گھر کر کے ہمیشہ آنکھوں میں پھرتے اور دلمیں سمائے رہتے ہیں۔

یہاں میں اپنے موضوع سے ہٹ کر اسکے کلام کے بدترین حصے کی نسبت بھی کچھ کہوں گا۔ یہہ حصہ ایک مختصر سی کتاب ہے جس کی اشاعت نے انگلستان میں عام سنسنی پیدا کر دی تھی ؛ ایسی سنسنی بائی رن کی "ڈان جان" Don Juan کی اشاعت کے بعد سے ابتک کبھی نہیں ہوئی۔ گو شاعرانہ حیثیت سے یہ ایک بہت بڑا لیرکل Lyrical تحفہ ہے، جو اس کتاب کے ذریعے اس نے انگریزی ادب کو دیا ہے، لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہہ تحفہ بعض حیثیتوں سے نہایت غیر اخلاقی ہے ؛ ایسا شدید غیر اخلاقی کہ اس کے آگے بائی رن کی انتہائی عریانیاں بھی پاک اور معصوم نظر آتی ہیں۔ تعجب ہے اسکو زندہ رکھنا انگریزی پبلک نے کیسے جائز رکھا۔ لیکن شاید اس نے یہ زندگی اپنے حسن کی وجہ سے پائی ہے! چند سال ہوئے، مجھے یاد پڑتا ہے، ایک لائق انگریز تبصرہ نگار نے ایک فرانسیسی نظم کے متعلق لکھا تھا کہ ؛ یہہ نظم فرانسیسی زبان کی حسین ترین نظم ہے ؛ لیکن بدقسمتی سے مطبوعات میں اس کا ذکر تک نہیں کیا جا سکتا۔

اگر کسی شاعر کے کلام میں اعلیٰ محاسن کے ساتھ انتہائی عریانیاں بھی ہوں تو اس کے محاسن اسکی عریانیوں پر غالب ہو جائیں گے، اور اس کی عظمت ہمیشہ قائم رکھیں گے۔ عریانی ایک عیب ہے ؛ لیکن یہ عیب زندہ رہ سکتا ہے اگر اس میں کچھ حسن ہو۔ سوئن برن کا کلام فرنچ شاعری کیطرح اپنے محاسن کی وجہ سے قابلِ قدر، اور اپنی انتہائی عریانیوں کی وجہ سے قابلِ نفرت ہے ؛ کیونکہ اس نے نہایت بے باکی سے ان کہنی کہی ہیں۔ تاہم ہمیں اس کے اس حصۂ کلام کو بھی قبل از وقت کوئی رائے قائم کئے بغیر سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

ہمیں سوئن برن کو انسان کی حیثیت سے دیکھنا چاہیے۔ اگر کسی کی قلم سے کچھ غیر اخلاقی باتیں نکلیں، تو بلاتحقیق یہ نہیں فرض کر لینا چاہیئے کہ اس کی زندگی بھی ایسی ہی غیر اخلاقی ہوگی۔ یہہ

ضروری نہیں ہے کہ جو بڑی بڑی اخلاقی باتیں کہیں ان کا عمل بھی ویسا ہی ہو۔ **شیلی** اس کا ایک نمونہ ہے۔ وہ نہایت باعصمت شاعر تھا، اسکے مجموعۂ کلام میں ایک سطر بھی ایسی نہیں ہے جو نامناسب کہی جا سکے؛ لیکن بدقسمتی سے عملاً اسکی زندگی اس کے بالکل برعکس تھی۔ بخلاف اس کے **سوئن برن** جس نے ہزاروں غیر اخلاقی شعر کہے ہیں، اپنی عملی زندگی ایسے داغوں سے پاک رکھتا ہے۔ وہ شاعری میں جتنا عریاں اور بے عصمت ہے، عمل میں اتنا ہی باحیا اور باعصمت ہے۔ عام طور پر یہ غلطی کی جاتی ہے کہ شاعر کی صناعتی حیات Artistic feeling کو بدی کی حیات Vicious feeling سمجھ لیا جاتا ہے، اور جہاں وہ رسوم کی بندشوں سے الگ ہوتا ہے، یہ خیال کیا جانے لگتا ہے کہ وہ نظامِ اخلاق سے نفرت کر رہا ہے۔

تم تھوڑی دیر کے لئے اپنے تئیں ایک نوجوان طالب العلم کی جگہ سمجھو اور اپنے سامنے وہ تمام محسوسات و خیالات لانے کی کوشش کرو جو فطرتاً ایک نوجوان میں ہوتے ہیں۔ **سوئن برن** نے یہ عریاں نظمیں ایسے ہی زمانے میں کہی تھیں۔

مغرب کے ہر متمدن لڑکے پر کئی دور گذرتے ہیں۔ جن میں وہ انسانی تاریخ ارتقا کے مختلف دوروں سے گذرتا ہے، اور اس کی انفرادی زندگی میں نوعِ انسان کی تشریحی اور نفسیاتی تاریخ دہرائی جاتی ہے۔ تم دیکھو بچہ بالکل وحشی ہوتا ہے، اس میں نہ مذہب ہوتا ہے نہ رحم، اسکی ننھی سی روح بیدردی اور خود غرضانہ چالاکیوں سے معمور ہوتی ہے۔ اس میں سب سے پہلے جو قویٰ نشو و نما پاتے ہیں وہ حفاظت ذاتی کے قویٰ ہوتے ہیں، اور یہ اولین عہد انسانیت کے قویٰ ہیں۔ اسکے بعد گھر کی تربیت اس میں نیکی اور بدی کے خیالات، اور مذہبی حیات پیدا کرتی ہے، اس دور میں اسکی حالت بہت کچھ عہد متوسط کے انسان سے مشابہ ہوتی ہے، اور اسی کے ساتھ وہ تاریخ ارتقاء انسانیت کے عہد متوسط میں داخل ہوجاتا ہے۔ پھر کالج کا تعلیمی نصاب قدیم یونانی حیرت انگیز تہذیب سے اس کا تعارف کراتا ہے جس سے اس کے دل میں **یونان** کی سماجی تہذیب کا احترام پیدا ہوتا ہے، اور وہ موجودہ دنیا کے مقابلے میں اس زمانے کی اخلاقی برتری کی عظمت کرنے لگتا ہے، اور اس کے اندر عہدِ نوزائیدگی Renaissance

کے سے جذبات پیدا ہونے لگتے ہیں۔ اسکا نتیجہ یہہ ہوتا ہے کہ اگر وہ حسن کا احساس رکھتا ہے' اور اگر اس کے قوٰی کی تربیت زیادہ تر جمالیاتی Esthetical ہوتی ہے تو وہ محبت کے جوش سے لبریز ہوجاتا ہے' اور والہانہ طور پر قدیم فطرت پرستی Paganism کا احترام کرنے اور اسکے مقابلے میں جدید ماحول کو ناپسند کرنے لگتا ہے۔ یہ احساس اول تو اکثر و بیشتر عارضی ہوتا ہے' لیکن اگر کبھی اس کی جڑیں دل میں راہ پالیتی ہیں تو پھر اسکی ساری زندگی ہی کو بدل دیتا ہے ۔ یہ بات قابلِ لحاظ ہے کہ ایک ایسے نوجوان کے لئے جس پر پر جذبات جوانی چڑھ رہی ہو' کالج کا ادبی نصاب دفعتہً یونانی زندگی کی حسین اور دل فریب کہانی پیش کردے تو یہ یقینی امر ہے کہ انسانیت کے اولین جمالیاتی قوٰی اسکی زندگی کو متاثر کئے بغیر نہ رہ سکیں گے۔ اب ہمیں سوئن برن کی حالت پر غور کرنا چاہئے جس کے متاوز جمالیاتی اور عالمانہ قوٰی ان اثرات سے ابتدائے عمر میں دوچار ہوئے' ان سے اس کے نوجوان نفس کو زلزلے کا سا صدمہ پہنچا' اور اس کا فطری نتیجہ ایک شدید ردعمل کی صورت میں ظاہر ہوا جو تمام ادبی' مذہبی' اور سماجی رسوم کے خلاف تھا۔ اگرچہ زمانے اور ماحول نے اسکی مخالفت کی' اور دھمکیوں اور لعنوں کے اوچھے ہتیار لے کر قدیم فطرت پرستی کی روح کو جو اس کے نزدیک ایک خطرناک چھیڑ ملتی' چھپانے اور دبا دینے کی کوشش کی' لیکن یہ باتیں ایسی تھیں جیسے آگ پر تیل۔ وہ جوان تھا' اور اب بھی ہے' اور اک نہایت نڈر' مشتعل' اور باہمت طبیعت رکھتا ہے۔ ایک بڑا خیال دفعتہً اس کے سامنے آیا' اور اس نے ٹھان لیا کہ اس کو انجام دئے بغیر نہ رہوں گا۔ یہ خیال معمولی نہ تھا' بلکہ انگریزی شاعری کے لئے ایسی مسرور آزادی حاصل کرنیکی کوشش تھا جیسی آزادی فرانسیسی شاعر کو موجودہ زمانے میں حاصل ہے۔ اس نے اظہار خیال کی تمام راہوں میں کامل آزادی کے حقوق حاصل کرنے کی کوشش کی' اور مزاحمتوں کا ایسی بے جگری سے مقابلہ کیا جو اس سے پہلے کسی نے نہیں کیا تھا۔ یہ کتاب جس پر اعتراض کیا جاتا ہے اسی کوشش کا ثمرہ ہے۔

ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ سوئن برن ان اصلاحی کوششوں میں کامیاب ہوا' کیوں کہ اس کی کوششیں کسی قدر حد سے گذری ہوئی اور قبل از وقت تھیں۔ اسی کے زمانے میں ایک بڑا فرنچ شاعر

چارلس بودلیر Charles Budelaire تھا جس پر علانیہ سر عدالت نفرت کیگئی، حالانکہ اس کی نظمیں سوئن برن کی نظموں سے بہت کم دلیرانہ تھیں۔ اسی طرح ایک بڑے فرنچ ناولسٹ فلے برت Flaubret کو اپنے ایک ناول پر عدالت میں جواب دینا پڑا، جس کے خیالات اب بہت معصومانہ خیال کئے جاتے ہیں۔ فرنچ ادبیات میں آزادی کے مشہور علم بردار انشا پرداز زولا Zola اور شاعر ریشپن Richepin نے اظہار خیال کی ایسی آزادی کو جائز رکھے جانے کے لئے جو کوششیں کیں وہ سوئن برن کی کوششوں کے بہت بعد کیں۔ اسلئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ سوئن برن کی کوششیں بہت قبل از وقت تھیں۔ اسکو اپنی جلد بازی اب دیکھنی چاہئے۔ لیکن میں یہ بھی نہیں کہوں گا کہ وہ سرے سے غلطی پر تھا، کامل آزادی کا فرنچ شاعری پر یہ اثر ہوا کہ اب بھی اس میں اچھے خیالات ملتے ہیں، لیکن انگریزی ادب میں اس کا یہ اثر ہوا کہ سوقیت کے ساتھ غیر اخلاقی غلو کیا جانے لگا، اور جب اس چیز کا نیا پن ختم ہوگیا تو اس کے خلاف ردعمل شروع ہوا، اور قومی حیا اور نفرت نے اس کا خاتمہ کر دیا۔ یہ مختصر سا زمانہ انگلستان کی تاریخ میں ایک "کارنے وال" Carnival زمانہ تھا۔ انگریزی رائے عامہ کی موجوں نے پوری طرح اس کی مخالفت کی، اور جابرانہ قدامت پسندی نے کچھ دنوں کے لئے ادبی ترقی کی راہ میں بہت سنگین رکاوٹیں پیدا کر دیں۔ یہ امر واقعہ ہے کہ ہم انگریزی ادب میں وہ کام نہیں کر سکتے جو فرانسیسی ادب میں کر سکتے ہیں لیکن صرف ایک سوئن برن ایسا تھا جو یہ کام کر سکتا تھا، اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ انگریزی زبان پوری طرح مکمل بھی نہیں ہے۔ نہ اس میں جتنا چاہئے حسن ہے، نہ لوچ اور نہ عریانیوں کی نفیس ادا و تعبیر کی صلاحیت۔ اسکے علاوہ ایک بات یہ بھی ہے کہ انگریزی کیرکٹر اتنا شائستہ بھی نہیں ہے۔ ایک فرانسیسی نہایت جرأت اور حسن ادا کے ساتھ ایک نہایت ہی عریاں بات کہہ سکتا ہے، مگر ایک انگریز، سوائے سوئن برن کے، نہیں کہہ سکتا۔

میں سمجھتا ہوں کہ یہ بات اب پوری طرح تمھارے ذہن نشین ہو گئی ہوگی اور تم یہ فیصلہ کرنے کے قابل ہو گئے ہوگے کہ اس غلطی کی وجہ ایک بڑی حد تک اس کی جوانی، اور اس کی

حیرت انگیز خداداد قابلیت تھی۔ اُس نے اپنی اعلیٰ قابلیت سے جو کچھ کیا وہ انگریزی شعراء میں سے ایک بھی نہ کر سکا۔ یہ ایک صداقت ہے کہ صدیاں چاہئیں کہ انگریزوں میں کوئی دوسرا پیدا ہو جو ایسا کام کر سکے جیسا سوئن برن نے کیا۔ (باقی آئندہ)

ابوالخیر مودودی

نوٹ۔ مضمون بالا سے متعلق ہم آئندہ اظہار خیال کریں گے۔

کہتے ہیں کہ "اولڈ بوائے" کا نومبر نمبر اپنی کتابت، طباعت، اور صنعت کاری کے لحاظ سے بہت خوب رہا ہاں! ہوگا!! ہم تو یہ جانتے ہیں کہ رسالہ کو اس سے بہتر حالت میں لانے کی آئندہ سعی بھی ہمارے فرائض میں داخل ہے، اور ہم انشاءاللہ! اپنے فرض سے غافل نہ رہیں گے۔ ہمارے جن بھائیوں کو پریس کے کام کا تجربہ ہے، اُن کو رسالہ زیر بحث میں یکایک تغیر ضرور حیرت میں ڈال دیگا۔ سچ یہ ہے کہ ماہر فن کی حیثیت سے وہی اس کی بڑی قدر کر سکتے ہیں! کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ طباعت کے کسی کام کو انجام تک پہنچانا، رستم دستاں کے ہفتخواں سے کم نہیں، اور کام لینے والے کو کس قدر صعوبت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اپنے ناظرین پر اس امر کو ہم مخفی رکھنا نہیں چاہتے کہ دارالطبع جامعہ عثمانیہ کے مددگار مہتمم جناب مولوی ابوبکر خانصاحب خویشگی کی ذاتی دلچسپی، نفاست پسندی، اور ذوق سلیم کو اس باب میں بڑا دخل ہے، اور ایک خوش فکر شاعر کی طرح کبھی دو بجے رات کو آنکھ کھل جاتی ہے تو "اولڈ بوائے" ہی کے خیال کو دماغ میں لیکر اٹھا کرتے ہیں۔ برادر مکرم میجر سعید محمد خانصاحب اپنے ایک عزیز کا ایسا اچھا کام دیکھ کر ضرور خوش ہوئے ہوں گے۔ لیکن ہم اُنسے زیادہ خوش نصیب ہیں کہ اُن کے عزیز حیدرآباد میں بیٹھ کر اس کدوکاوش میں ہمارا ہاتھ بٹا رہے ہیں۔ مسٹر خویشگی نہ صرف فن طباعت کے ماہر ہیں، بلکہ فن جریدہ نگاری سے بھی خوب واقف ہیں، اور اس لحاظ سے ہم اُن کے مفید مشوروں سے گاہے گاہے فائدہ حاصل کرتے رہتے ہیں۔

شعلہ ایمانی

جناب مولوی سید سراج الحسن صاحب ترمذی

عالم کو منور کر اے شعلۂ ایمانی
پھر سوزِ دروں سے کر پیدا شرر افشانی

ہاں جادۂ ملت سے لغزش نہ قدم کھائے
دے دلکو ثبات ایسا اے قوتِ ایمانی

جو پھونک دے سینہ کو اور دلکو جلا ڈالے
وہ سوز عنایت کر اے آتشِ پنہانی

فاران کے شعلہ کو بھڑکا دے جہاں بھر میں
پھر برقِ تجلے بن اے جذبۂ روحانی

پھر شمعِ رسالت سے عالم میں اجالا کر
پھر خاطرِ مسلم سے کر دور پریشانی۔

مشہور زمانہ تھی کل تک تری آزادی
اے بادِ صبا! آ کے ویرانہ میں زندانی

سطوت کی زلیخائی ہے والہ و شیدائی
اب چاہ سے باہر آ اے یوسفِ کنعانی

تو سایۂ دولت ہے گم کیوں تری غیرت ہے
اے بالِ ہما کبتک ہر خس کی مگس رانی

سوکھی ہوئی کھیتی کو پھر نشو و نما دیکر
اک بار ہرا کر دے اے رحمتِ یزدانی

کیا حال کہوں اپنا اے ترمذیٔ محزوں!
اس کشمکشِ غم سے ہوتا ہے لہو پانی

۷

دل حسرت زدہ تھا مائدۂ لذتِ درد
کام یاروں کا بہ قدرِ لب و دنداں نکلا

شرح :- "یعنی جس میں جتنی قابلیت تھی اس نے اسی قدر مجھ سے لذت درد کو حاصل کیا ورنہ یہاں کچھ کمی نہ تھی" لیکن اس شرح سے یہ نہیں واضح ہوتا کہ لذتِ درد کے "ز" یا کون یار ہیں؟ اور کس طرح انہوں نے اس خوان نعمت سے بہ قدر حوصلہ لب و دنداں سیری حاصل کی؟ میرے خیال میں مصنف کی مُراد یاروں سے یا تو عشق ہے جس نے قایل کے دل حسرت زدہ کے خوان نعمت سے کام نکالا جیسا کہ مصنف نے اور ایک جگہ اسی مضمون کو صاف صاف لفظوں میں ادا کیا ہے۔ شعر

جگر کو مرے عشق خوننابہ مشرب
لکھے ہے خداوند نعمت سلامت

یا یہ کہ قایل دردرسیدہ ہے (جیسا کہ مرزا کی سوانح پڑھنے والوں کو معلوم ہے اور جس کا اظہار خود ان کے کلام سے جابجا ہوتا ہے) اسلئے اس کا کلام سراسر مائدہ لذت درد ہے جس سے قارئین و سامعین بقدر استعداد فہم لطف حاصل کرتے ہیں۔ لیکن یہ معنے لینے کے لئے دلِ حسرت زدہ کے ساتھ کچھ اور اضافہ کرنا ہوگا یعنے یوں کہنا پڑیگا کہ "میرے دلِ حسرت زدہ سے نکلا ہوا کلام مائدہ لذت درد تھا جس سے کام یاروں کا الخ"

حقیقت یہ ہے کہ شعر میں کوئی لفظ ایسا نہیں جو ان میں سے کسی قرینے پر بھی دلالت کرے۔

۸

تالیفِ نسخہ ہائے وفا کر رہا تھا میں
مجموعۂ خیال ابھی فرد فرد تھا

شارح مدظلہ نے مجموعۂ خیال کے فرد فرد ہونے کے معنے یہ بتائے ہیں کہ "عقل و ہوش کا مجموعہ غیر مرتب تھا یعنے ناتجربہ کاری کا زمانہ تھا۔" میں عرض کروں گا کہ مجموعہ ہوش و عقل کے فرد فرد ہونے کو ناتجربہ کاری سے کیا تعلق! یہ صورت تو اختلال حواس اور فتور عقل پر دلالت کرتی ہے نہ کہ ناتجربہ کاری پر۔ بظاہر مصنف کا منشا یہی ہے کہ وہ بچپن ہی سے جبکہ وہ عشق کا مفہوم سمجھنے کی قابلیت نہ رکھتا تھا حسن پرست اور بندۂ عشق تھا (تالیف نسخہ ہائے وفا کر رہا تھا)۔ اور اس مطلب کی توثیق لفظ "ابھی" سے ہو رہی ہے، لیکن الفاظ اس مضمون کے ساعد نہیں ہیں۔ اگر خیال کی جگہ فہم یا ادراک کا لفظ ہوتا تو معانی میں یہ بے ربطی نہ پیدا ہوتی۔

۹

شمارِ سبحہ مرغوبِ بتِ مشکل پسند آیا
تماشائے بہ یک کف بردن صد دل پسند آیا

مضمون صاف ہے۔ شارح علامہ تحریر فرماتے ہیں کہ "یہ بھی احتمال ہے کہ مصنف نے بہ یک کف بردن صد دل میں حساب عقد انامل کی طرف اشارہ کیا ہو" (عقد انامل کا حساب بھی بتایا ہے) یہ تاویل بعید ہے۔ ایک ایک ہتھے میں سو سو دلوں کو لینے کی کوشش بجائے خود مشکل پسندی کی دلیل ہے۔ مرزا بیدلؒ چہار عنصر میں ایک مقام پر لکھتے ہیں: "اگر چوں سبحہ صد دل فراہم آرند یکے با دیگرے نہ جوشند۔" یہی سبحۂ صد دل ہے جو مرزا غالب کے ہاتھ آیا ہے۔ مرزا غالب نے سبحہ ہزار دانہ اشک بھی کہا ہے (تلاش کرو جدید نسخہ حمیدیہ دیوان غالب میں) اور یہ خیال بھی بیدل ہی کے یہاں سے لیا گیا ہے۔ ع

کہ چو سبحہ ہر نفسم او فتد ہزار آبلہ کارہا

۱۰

دہر میں نقش وفا وجہ تسلی نہ ہوا
ہے یہ وہ لفظ جو شرمندۂ معنی نہ ہوا

شارح نے "وفا" سے وفاداری عشاق مراد لی ہے مگر کوئی وجہ نہیں پائی جاتی کہ عمومیت کو خصوصیت سے بدلا جائے۔ میرے نزدیک تو مرزا غالب بھی وفا کے اسی فقدان عام کے شاکی ہیں جسکے شیخ سعدی اس شعر میں شکایت کرتے ہیں ؎

یا وفا خود نبود در عالم | یا مگر کس درین زمانہ نکرد

فرق صرف اسی قدر ہے کہ ؎

ہیں دل عاشق و رقیب صا دو نظر کے منظر | ایک پہ ہیں ہزار نقش صفحہ سادہ ایک ہے

۱۱

سبزۂ خط سے ترا کاکل سرکش نہ دبا
یہ زمرد بھی حریف دم افعی نہ ہوا

شرح ہے کہ "زمرد کے سامنے سانپ اندھا ہو جاتا ہے۔ مگر تیرا سبزۂ خط کیسا زمرد ہے کہ افعی زلف پر اسکا اثر نہ ہوا"۔ یہی معنے شوکت صاحب نے بھی لئے ہیں۔ مگر اس شرح سے سبزہ خط کا استخفاف ہو گیا۔ حالانکہ۔ ع

ہیچ عاشق سخن تلخ بہ معشوق نگفت

میرے خیال میں مصنف کا مقصد افعی زلف کی سرکشی پر زور دینا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ زمرد سے افعی دب جاتا ہے مگر تیرا افعی کاکل ایسا سرکش ہے کہ عام زمرد کا تو کیا ذکر سبزۂ خط کے زمرد سے بھی نہ دبا۔ یعنے انتہا کا سرکش ہے۔ دوسرے مصرع کا حرف تاکید "بھی" انہیں معنوں کا موید ہے۔

۱۲

دل گزرگاہ خیال مے و ساغر ہی سہی
گر نفس جادۂ سرمنزل تقوی نہ ہوا

اس شعر کے قافیہ کی نسبت شارح علامہ نے یہ افادہ ادبی فرمایا ہے کہ "مصنف نے فارسی والوں کا اتباع کیا ہے کہ وہ لوگ عربی کے جس کلمے میں ی دیکھتے ہیں اسکو کبھی الف اور کبھی یا کے ساتھ نظم کرتے ہیں؛ تمنی و تمنا، تجلی و تجلا، تسلی و تسلا، ہیولی و ہیولا، دنیی و دنیا بہ کثرت اُن کے کلام میں موجود ہے"۔ میں اسپر اتنا اضافہ اور کروں گا کہ خلاف محاورہ اسطرح کے اجتہادات جائز نہیں سمجھے جاسکتے۔ الف مقصورہ جو عربی میں بصورت ی لکھا جاتا ہے اس پر ختم ہونے والے وہی الفاظ اُردو میں یائے معروف کے ساتھ قافیہ ہو سکتے ہیں جو عام طور پر ہماری زبان میں ی کے ساتھ بولے جاتے ہیں جیسے عیسیٰ۔ لیلیٰ۔ تسلی۔ تجلی۔ لیکن اگر دنیا کی جگہ کوئی دنیی لکھے تو سننے والے کو بے تحاشا ہنسی آجائیگی۔ یہی حال ہیولی اور تقوی کا ہے۔ غالب کی شان استادی اُن کیلئے اس اتباع یا اجتہاد کو جائز رکھ سکتی تھی مگر دوسروں کو ایسے قوافی سے اجتناب واجب و لازم ہے۔

۱۳

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولیٰ برق خرمن کا ہے خون گرم دہقاں کا

حاصل شرح ہے: "یعنے کہ حرارت عزیزی جو کہ باعث حیات ہے، خود وہی ہر وقت تحلیل و فنا بھی کر رہی ہے"۔ شارح علامہ نے جو مطلب اس شعر کا بیان فرمایا ہے اس سے بہتر نہیں ہو سکتا اسلئے کہ عمر بالضم والفتح زندگانی و زیستن کے معنوں میں ہے اور تعمیر کے معنے ہیں کسی کو بڑی عمر دینا۔ لیکن عام طور پر اُردو زبان بولنے اور سمجھنے والوں کے حاشیۂ خیال میں بھی تعمیر کے یہ لغوی معنے نہ ہوں گے یہاں سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ تعمیر و خرابی کو خرمن اور خون گرم دہقان سے کیا مناسبت ہے اور یہ استعارات کہاں تک باہم دست و گریباں ہیں؟ کمیت مکان کے اندر ہے یا مکان معیت کے اندر؟

دوسری جگہ مصنف نے پھر اسی مضمون کو کسی قدر تغیر کے ساتھ اس طرح نظم کیا ہے ؎

کارگاہ ہستی میں لالہ داغ ساماں ہے — برق خرمن راحت خون گرم دہقاں ہے

اور اس شعر کا مطلب شارح نے خود مصنف کے الفاظ میں نقل کیا ہے جو یہ ہے: "موجودیت لالے کی

منحصر نمایش داغ پر ہے ورنہ رنگت تو او پھولوں کا بھی لال ہوتا ہے ۔ بعد اس کے یہ سمجھ لیجیے کہ درخت یا غلہ جو کچھ بو یا جاتا ہے وہقان کو جوتنے بونے پانی دینے میں مشقت کرنی پڑتی ہے اور ریاضت میں لہو گرم ہوجاتا ہے ۔ مقصود شاعر کا یہ ہے کہ وجود محض رنج وعنا ہے ۔ مزارع کا وہ لہو جو کشت وکار میں گرم ہوا ہے وہی لالے کی خرمن کا برق ہے ۔ حاصل موجودیت داغ اور داغ مخالف راحت، اور صورت رنج ذاتی غرض یہ ہے کہ ہستی وار بلا ہے اگر کوئی یہاں راحت پہنچانے کا قصد کرتا ہے تو وہ راحت عین آفت ہوجاتی ہے ۔ وہقان لالے کے لئے خون گرمی وسرگرمی کرتا ہے لیکن اُس سے لالے کو داغ حاصل ہوتا ہے ۔" اب میں ایک شعر مرزا بیدل کا پیش کرتا ہوں اسے بھی ملاحظہ فرمالیجے ۔ فرماتے ہیں ؎

شعلہ کاراں را بہ خاکستر قناعت کردن است ہر کجا عشق است دہقاں سوختن ہم حاصل است

اہل نظر سمجھ سکتے ہیں کہ شعر بالا میں اور مرزا کے اشعار میں کیا تعلق ہے ۔ 'سوختن' کا حاصل کشت ہونا اس خیال کا مورث ہے کہ " مزارع کا جو لہو کشت وکار میں گرم ہوا ہے وہی خرمن کا برق ہے " لیکن مرزا بیدل یہ فرماتے ہیں کہ عشق کی دہقانی کا حاصل سوختن ہے اسلئے عاشقوں کو خاکستر ہی پر قناعت کرنا چاہیئے۔ یعنے عشق کا نتیجہ ہی یہ ہے کہ عاشق کی ہستی مٹ کر خاک سیاہ ہوجائے اسلئے عاشق کو چاہیئے کہ وہ اپنی تباہی، بربادی، نامرادی، وغیرہ وغیرہ پر قانع رہے اور فنائیت کو اپنی ریاضت کا حاصل سمجھے ۔ مرزا نے اس خیال میں ترمیم وتحریف کرکے دوسرے الفاظ میں نظم کرنا چاہا ہے ۔ ایک جگہ فرماتے ہیں کہ جسطرح خود دہقاں کا خون گرم خرمن کی برق کا ہیولا ہے یعنے جس طرح دہقان کے خون کی گرمی یا خون گرمی خرمن کے لئے برق بنجاتی اور اُسے خاک سیاہ کردیتی ہے اسیطرح میری تعمیر (زندگی دراز) میری خرابی (فنا) کا کا باعث ہے ۔ اس مثال کی بے ربطی ظاہر ہے اس لئے کہ دہقان کی خون گرمی یا اُس کے خونِ گرم کا برق بنکر خرمن پر گرنا اور اسکو جلادینا ادعائے محض اور بے معنی سی بات ہے حقیقتِ واقعہ اور عینِ مشاہدہ تو یہ ہے کہ دہقاں کی خون گرمی ہی کشت زار کی سرسبزی اور فراہمی خرمن کا باعث ہوتی ہے ۔ تعمیر وخرابی اور خرمن وبرق کے الفاظ بھی غیر متناسب ہیں ۔ پس اگرچہ خیال صحیح ہے مگر مثال خلافِ حقیقت اور غیر مربوط ہے، اسلئے شعر کے الفاظ معانی سے ربط نہیں رکھتے ۔

دوسرے شعر میں خونِ گرم دہقاں کو برق خرمن راحت کہا گیا ہے اور اس دعوے کے اثبات میں پہلا مصرع "کارگاہ ہستی میں لالہ داغ ساماں ہے" پیش ہوا ہے۔ جسکی تشریح خود مصنف نے کی ہے۔ مگر یہ تشریح بھی کچھ ایسی ہے کہ شارح علامہ نے اسکو نقل کرکے سکوت اختیار فرمایا ہے۔ لیکن میں عرض کرونگا کہ یہاں بھی خونِ گرم دہقاں کا لالے کی داغ سامانی کا باعث ہونا ادعاہی ادعا ہے اور اسکو حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں۔ حضرت شوکت مرزا کے بہت بڑے معترف ہیں لیکن وہ بھی فرماتے ہیں کہ "اس شعر اور مندرجۂ بالا شعر کے مصرعوں میں باہم ربط نہیں۔ بھلا لالہ کو کارگاہ سے کیا تعلق۔ اگر مصرع اولی یوں ہوتا ؎

گلستان ہستی میں لالہ داغ ساماں ہے

تو کچھ مناسبت بھی نکل آتی پھر بھی دوسرے مصرعہ کو پہلے مصرعہ سے لگاؤ نہیں۔"

۱۴

نہ ہوگا یک بیاباں ماندگی سے ذوق کم میرا
حباب موجۂ رفتار ہے نقش قدم میرا

شرح ہے "رفتار کو موج اور نقش قدم کو حباب سے تشبیہ دی گئی ہے۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح موج کا ذوق روانی کم نہیں ہوتا اسی طرح میرا ذوق صحرانوردی بھی کم نہ ہوگا۔" مطلب تو حاصل ہوگیا لیکن الفاظ شعر پر پھر ایکبار نظر ڈال جائیے۔ شاعر کہنا یہ چاہتا ہے کہ "جسطرح (پائے) موج کا ذوق روانی (کثرت حباب کی وجہ سے) کم نہیں ہوتا' اسیطرح میرا ذوق صحرانوردی (کثرت آبلہ پائی سے) کم نہیں ہوتا۔ یعنے میرے آبلۂ پا جو حباب موجۂ رفتار ہیں ذوق صحرانوردی میں مزاحم نہیں ہوتے لیکن بجائے "آبلۂ پا" کہنے کے قافیہ کی مجبوری سے شاعر "نقش قدم" کہہ گیا۔ جو صحیح نہیں ہوسکتا' اسلئے کہ نقش قدم مانع رفتار یا مورث ماندگی نہیں ہوا کرتے۔ بہرحال پائے تخیل کی آبلہ داری سے معانی شعر میں لنگ پیدا ہوگیا ہے۔

حقیقتِ پروانہ

اے عاشقِ دل خستہ! اے سوختۂ الفت!!
تو رازِ محبت کا اک سالکِ یکتا ہے
رگ رگ میں نہاں تیری، ہے آگ محبت کی
تو عشقِ مجسم ہے، تو حسن کا بندہ ہے

تو رہبرِ کامل ہے۔ اس عشق کی منزل میں
ہر نقشِ قدم تیرا، اک شمعِ ہدایت ہے
تقلید تری واجب، ہے رہروِ الفت پر
یعنے ترا جل بجھنا، اک درسِ محبت ہے

آ۔ دل میں تجھے رکھ لوں آ، اے شیفتۂ الفت!
تیری ہی طرح میں بھی، بیمارِ محبت ہوں
بیخود بھی ہوں مضطر بھی، دیوانہ و رسوا ہوں
مستِ مئے الفت ہوں، سرشارِ محبت ہوں

تو شمع کا عاشق ہے، میں شمعِ حقیقت کا
تو اسکا ہے شیدائی، میں اسکا ہوں دیوانہ
آ۔ جان فدا کر دیں، جل بجھ کے سرِ محفل
رہ جائیگا دنیا میں، دونوں کا اک افسانہ

دفینہ

جوابِ پروانہ

کیا مجھ سے مخاطب ہے، اے نرگسِ مستانہ! کس طرح سناؤں میں، حالِ دلِ دیوانہ
پُرشور ہے، غمگین ہے۔ بسمل ہے محبت میں منظور ہے گر تجھ کو، سُن لے مرا افسانہ

تو نورِ مشکل ہے، میں سوزِ مجسم ہوں تو شمعِ منور ہے، میں سوختہ ساماں ہوں
کچھ میری حقیقت کو، محسوس کیا تو نے؟ جلنا مرا شیوہ ہے، میں حسن پہ قرباں ہوں

آنکھیں مری کہاں ایسی، ہوں قابلِ نظارہ ہاں! تیری محبت میں، پھرتا ہوں میں آوارہ
آ، دونوں بہم ملکر، دکھلا دیں زمانہ کو تو شمعِ مرے دل کی، میں ہوں ترا "پروانہ"

بسمل

مولوی سید مظہر اللہ صاحب اپنے اوقات فرصت کو خالص مذہبی کاموں پر صرف فرماتے رہتے، اور اس باب میں عملی طور پر اپنی وابستگی کا ثبوت دیتے رہتے ہیں۔ مسلمانان علاقہ زیدپلسنی حیدرآباد کی جانب سے ۱۰ ربیع الاول ۱۳۴۶ھ کو وکٹری گراونڈ پر مجلس میلادالنبی ہمارے بھائی کی عملی دلچسپیوں کا تازہ ثبوت ہے۔ میلاد کمیٹی کے معتمد (سکرٹری) کی حیثیت سے اس کام میں جو تکلیف انہوں نے برداشت کی ہے اسکا اجر تو بارگاہ ایزدی سے ملے گا، مگر دنیاوی صلہ یہ ہے کہ جلسہ بہت کامیاب رہا، اور حضور پُرنور نے بھی اس مجلس مبارک میں شرکت فرماکر اپنے حسن عقیدت کا اظہار فرمایا۔ خداوند عالم اپنے بندوں کو حقیقی تعلیم اسلام سے بہرہ ور ہونے کی توفیق عطا فرمائے، اور اس مجلس مبارک میں جن مواعظ کو حاضرین نے سنا ہے، اُن سے سبق حاصل کریں۔

اولڈبوائے کا دورِ ثالث

ہمچو سبزہ بارہا روئیدہ ام　　ہفت صد ہفتاد قالب دیدہ ام

کہتے ہیں کہ بلی کے سات جانیں ہوتی ہیں معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے "اولڈبوائے" میں بھی کیٹ Cat کی روح حلول کر گئی ہے کہ مرتا ہے اور پھر جی اٹھتا ہے۔ "اولڈبوائے" نے پہلا جنم کاشی کی سرزمین مقدس پر لیا جبکہ اوسکی ماں بھائی عترت؛ اور باپ علیگڈھ کے کھلنڈروں کے سرغنہ بھائی شوکت تھے جو اب نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام دنیائے اسلام میں صرف معلم الملکوۃ سے دوسرے درجہ کی شہرت رکھتے ہیں اور "مولانا" کے ڈراونے لقب سے یاد کئے جاتے ہیں۔ "اولڈبوائے" کا یہ پہلا قالب یا پہلا دور بہت زیادہ دلکش اور دلفریب تھا لیکن جنگِ عظیم کے آتش فشاں شعلے اسکے واسطے برق خرمن بنگئے اور چند سال میں علیگڈھ کی صحبتوں کا یہ افسانہ گو نظروں سے غائب ہوگیا؛ سید احمد خانی میکدہ کے متوالے برسوں اس کمسن ساقی کی یاد میں خون کے آنسو بہاتے رہے۔

یاد ایام فراموش ہونے کو تھی کہ فرزندان علیگڈھ کے نشیمن یعنے نواب سکندر صولت کے دارالاقبال[ل] بھوپال سے "اولڈبوائے" نے دوسرا جنم لیا اور چہار طرف سے مبارک سلامت کی صدائیں گونج اٹھیں اور

ل فانی ہی نہیں فانی! میں درسِ فنا بھی ہوں ۔ افسانۂ عبرت ہوں اور عبرتِ افسانہ (اولڈبوائے)

بہت جلد سعید کا نورِ چشم اولڈبوائز کی گودوں میں کھیلنے کودنے لگا۔ اگرچہ اولڈبوائے کا یہ نقش ثانی پہلے کی طرح تو حسین اور کرشمہ زا نہ تھا تاہم علیگڈھ کے شیدائیوں کے لئے آنکھوں کا تارا تھا۔ یہ دور بھی چشم زدن میں ختم ہوگیا۔

بھوپال کے بعد اب مسلمانانِ ہند کی سطوت گم شدہ کی یادگار احسن البلاد حیدرآباد سے "اولڈبوائے" نے تیسرا جنم لیا ہے اور اس دفعہ کارساز عالم نے کمسنی میں بھائی منظر کی گود آباد کی ہے۔ وَكَذَالِكَ اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يُرِيْد۔ بھائی منظر ایک مشہور مضمون نگار باپ کے خلف الرشید اور خود بھی علمی مذاق اور ذوق سلیم رکھتے ہیں، اسلئے یہ امید کرنا کچھ بیجا ہوگا کہ انکی آغوش عاطفت میں اولڈبوائے عمر طبیعی حاصل کرسکے گا۔ آمین

"اولڈبوائے" اسوقت ایک سخت پر آشوب زمانہ میں عالم وجود میں آیا ہے جبکہ علیگڈہ کی شہرت اور سر سید کی عمر بھر کی کمائی معرض خطر میں ہے اور کمسن مسلم یونیورسٹی کے کارنامے میزان محاسبہ میں تولے جارہے ہیں۔ سر ابراہیم رحمت اللہ صاحب کی صدارت میں ہر ہائینس چانسلر صاحبہ کی قائم کردہ کمیٹی تحقیقات عمال یونیورسٹی کے دفتر اعمال کو جانچ رہی ہے۔ فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ ۝ فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ ۝ وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ ۝ فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ ۝۔ ایسے وقت میں "اولڈبوائے" کے پہلے نمبر میں یونیورسٹی کے نیک و بد کے متعلق ایک حرف بھی نہ ہونا جس قدر مایوس کن ہے اسکا اندازہ کرنا دشوار ہے خاصکر جبکہ اس کے معاونین قلمی کی فہرست میں نواب نذیر جنگ اور مسٹر عنایت اللہ جیسے فرزندان کالج کے نام درج ہیں جو سر سید اور نواب محسن الملک مرحوم کے عہد کی زندہ تاریخ ہیں۔

اردو علم ادب کے رسالے تو ہندوستان میں سیکڑوں شائع ہوتے ہیں اور انمیں سے بعض قبولیت عام کے تمغے بھی حاصل کرچکے ہیں۔ "اولڈبوائے" کی ضرورت اور مقبولیت ادبی اور تاریخی مضامین کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ وہ صرف اس حالت میں اپنے وجود کو باوجود بنا سکتا ہے کہ۔ ع

دور میں ساقی رہے گردش میں پیمانہ رہے

اور میخوار ان کالج کو اپنے میکدۂ طفولیت کی مئے کہنہ ترقی جدید کے جام نو میں بھر بھر کر پلائی جائے۔ بطور نمونہ کے میں چند عنوان ذیل میں درج کرتا ہوں جن پر مضامین کا سلسلہ غالباً پرلطف اور دلچسپ ہوگا:۔

(۱) محمڈن کالج اور مسلم یونیورسٹی کے طلباء کی زندگی کا موازنہ۔

(۲) مسلم یونیورسٹی کے قانون اور قواعد پر تنقیدی مباحثہ۔

(۳) سرسید کا طلباء کے ساتھ برتاؤ اور اسکے متعلق حکایات اور لطائف۔

(۴) نواب محسن الملک مرحوم کی کالج لائف کے افسانے۔

(۵) مسلم یونیورسٹی Co-operative سوسائٹی قائم کرنے کا خیال اور اسکا اسکیم۔

(۶) اولڈبوائز ایسوسی ایشن کی طرف اولڈبوائز کو متوجہ کرنے اور ایسوسی ایشن کو زیادہ دلچسپ اور بکارآمد بنانے کے تدابیر اور تجاویز۔

(۷) مسلم یونیورسٹی میں کارآمد تعلیم کے اجراء کے اسکیم اور ان کی عملی تدابیر۔

(۸) مسلم یونیورسٹی کی تعلیم اور تربیت کا ہندوستان کی دوسری یونیورسٹیوں سے مقابلہ۔

(۹) مسلمانوں کو یونیورسٹی کی طرف متوجہ کرنے کی تدابیر۔

یہ اور اس قسم کے بہت سے ایسے عنوان ہیں جن پر مضامین کا ایک نہایت دلچسپ اور کارآمد سلسلہ جاری ہو سکتا ہے۔ بہرحال میں "اولڈبوائے" کا ہر حالت میں پرجوش خیر مقدم اور اس کی درازئ عمر کی دعا کرتا ہوں ؎

تم سلامت رہو ہزار برس ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

امید ہے کہ بھائی منظر علی صاحب میری ہمدردانہ اور مخلصانہ تنقید کو معاندانہ نکتہ چینی پر محمول نہ فرمائینگے اور جس خلوص کے ساتھ یہ چند سطور سپرد قلم کئے گئے ہیں ویسے ہی فراخدلی سے وہ انکو اپنے توجہ کے قابل خیال کرینگے۔ میں بھی انشاءاللہ العزیز اپنی تھوڑی سی بساط اور گوناگوں مصروفیتوں کے باوجود گاہ گاہے اپنے خیالات پریشان کو حوالہ قرطاس کرکے خراج الفت ادا کرتا رہونگا ؎

مٹیں دنیا کی رسمیں سب پرانی مگر الفت کا اک رسم کہن ہے

محمد یعقوب مرادآباد

جلوس کا ہاتھی

کہتے ہیں کائنات کی جملہ اشیاء اپنا کمال چاہتی اور اسلئے ارتقائی کینچلیاں ڈالتی جاتی ہیں۔ آفاقی طور سے یہہ بات سچ ہو یا نہو، ہمیں اس سے یہاں سروکار نہیں، البتہ بدیہات میں بنئے کی توند اور ہمارے دوست مسٹر خواہ مخواہ کی "ابعاد ثلاثہ" پر یہ اصول کچھ اس نزاکت سے چپا ساگیا ہے کہ تصور کے ساتھ ہونٹوں پر ہنسی کھیلنے لگتی ہے۔ پھر کیا مجال جو لالہ روکڑ چند کی توند یا مسٹر موصوف کی (لمبائی۔ چکلائی۔ موٹائی) میں سے کوئی شعبہ بھی سانس کے ساتھ نہ بڑھا ہو! وہ تو یوں کہئے بڑی خیر گزری کہ یہ دونوں بھاری بھرکم ہستیاں (یہاں بجائے لالہ جی کے ان کی توند سے خطاب ہے!) ہندوستان کے ہی بطن سے پیدا ہوئیں اور جو خدانخواستہ کہیں یورپ یا امریکہ میں ان کا شان نزول قرار پاجاتا تو نہ جانے اب تک کتنی مرتبہ کلابینوں سے ان کی بوٹی بوٹی دیکھ لی جاتی ہو کیونکہ وہاں سائنس ایک طرف تو جوہر Atom سالمہ Molecule اور برقیہ Electron کی جانچ پڑتال سے یہ ثابت کر رہا ہے کہ انسان زیادہ تر خالی خولی ہی ہے۔ یعنی یہی کہ اگر بفرض انسان کے ان اجزائے ترکیبی کی قوتیں باہم ٹکرا دی جائیں تو چھ فیٹ کا لم ترڈنگ آدمی خیر سے مکھی کیا مچھر بنکر رہ جائیگا؛ مگر دوسری طرف دیکھا جاتا ہے کہ مسٹر خواہ مخواہ کا وجود ذیجود یا میاں بنئے سلمہ کی بھاری بھرکم توند اس استدلال کی راہ میں زبردست روڑا بنی ہوئی ہے۔ جس سے انکار کرکے ظاہر ہے کہ انسان کیونکر کافر بن جاتا! اس لئے ضرور تھا کہ یہ دونوں سپوت سائنٹیفک تجربوں کے پالے پڑتے اور گھٹر گھٹر اکر نہ جانے غریب کیا سے کیا بن جاتے! یوں اس سائنس نا آشنا

زمین پر بھی لوگ ان کی ممدت نمو سے غافل نہ رہ سکے۔ چنانچہ ایک صاحب نے تو بلا کی جلی کٹی سنائی، مگر یہ خود دبلے پتلے ہیں!

"اماں! توند ہو یا مسٹر خواہ مخواہ! ان کا مایۂ خمیر تو خمیری آٹا بن گیا ہے، جو دم بدم پھیلا پھولا اٹھتا ہے!"

مبادا قارئین کرام آئندہ توند کے ہیر پھیر سے الجھ پڑیں، میں یہیں سے اسے منہا کر دینا مناسب سمجھتا ہوں۔ اس لئے آگے جو کچھ عرض خدمت ہوگا وہ صرف مسٹر خواہ مخواہ کے چند اوصافی سوانح کا تعارف ہے اور بس! جنہیں تاریکی میں رکھنا ایک طرف موصوف کی صریح اہانت تھی تو دوسری طرف تفنن لطیف کا خون بھی ہوا جاتا تھا!

مسٹر خواہ مخواہ بچپن ہی سے لوگوں کی آنکھ کا تارا بنے رہے۔ تھا یہ کہ آپ کے بڑوں میں سے چند حضرات .... بڑے قلم کے دھنی گزرے ہیں۔ جن کے طفیل یہہ ماہ و شماہ کے گویا نورعین اور لخت جگر تھے! خیر، یہ تو ان کی عامیانہ زندگی تھی، رہی سکول سے کالج تک کی بھولی بھالی زندگی تو وہ بھی عجب عجب "اعاظم توصیف" سے مملو ہے! اسکول ہو، کالج ہو یا نہو، موصوف اپنے وجود ذیجود کے گدگدانے والے آماس کے علاوہ بھی اپنی خوش فعلیوں سے ضیافت مذاق فرماتے رہتے تھے۔

ایک دفعہ کا ذکر سنئے، نصیب دشمناں مسٹر موصوف کی طبیعت انمنی ہو گئی، احباب کو پتہ چلا تو ڈنڈا ڈولی کر کے زبردستی حکیم جی کے ہاں لے پہنچے۔ اہتمام یہ تھا کہ "پا بہ دستِ دگرے دست بدستِ دگرے"! حکیم جی گو پبلک میں قضاءالملک مشہور تھے، مگر تھے بڑے ستم ظریف! ساتھ ہی اس درجہ باکمال بھی تھے کہ بجائے نبض کے قیافہ دیکھکر علاج کیا کرتے! انھیں دیکھتے ہی تڑ سے بول اٹھے:۔

"صاحبزادے! بلا کے بلغمی واقع ہوئے ہو، خیر، نسخہ لکھے دیتا ہوں، کاسر ریح، محلل بلغم ہے! دیکھنا ان چیزوں کا پرہیز کر لینا۔"

بھلا طالب علموں کے سامنے یہ مرض تشخیص ہو! طالب علم بھی علی گڈھ کے جو غریب معصوم محض ہوا کرتے ہیں! اور بات جہاں کی تہاں رہ جائے۔ ایک صاحب بڑھ ہی تو گئے اور لگے حکیم جی کا شکریہ

اوا کرنے ! ضمناً نہایت تپاک سے یہ بھی عرض کیا کہ مسٹر خواہ مخواہ کا بھولے سے عقیقہ میں نام ہی نہیں پڑا تھا! جس سے محبانِ کالج کو بڑی تشویش تھی! آپ نے تشخیص مرض کے ساتھ اس مہم کو بھی سر فرما دیا! بڑی عنایت اور عزت افزائی کی! دیگر ہمسر کانوں نے یہ سنکر ایک فرمائشی قہقہہ اڑایا اور اس سمے گھڑی سے میاں خواہ مخواہ "میاں بلغمی" مشہور ہو گئے!

غرض مدت مدید تک کالج اسی طرح آپ کے وجود با جود سے محظوظ ہوتا رہا مگر سنا ہے شدہ شدہ ایک وہ زمانہ آیا کہ ہندوستان کی یونیورسٹیوں کی سعی ناشکور رہی اور باوجود کوشش جب موصوف یہاں سندی نہیں بن سکے، تو ایک ادعائی بزرگ کے اعزازی فرزند بنکر یورپ سدھارے! لیکن اس میں بھی اختلاف ہے، بعض مبصرین کی رائے ہے کہ آپ چند وجوہ سے صرف بمبئی تک کی سیر کر کے چلے آئے! واللہ اعلم!!

خیر! یورپ یا بمبئی سے کوئی آٹھ سال میں لوٹے تو اپنی قابلیت پر آپ نازاں تھے۔ لوگ انہیں ابھی "تعزیرات" کی چوٹی کی دفعات کا عامل ہی سمجھ رہے تھے! کہ موصوف نہ معلوم خود کو کیا کیا سمجھنے لگے، اور جہاز سے اترتے ہی لگے مرغے کی طرح اکڑنے! سنا ہے سمندر کی ہوا ہندوستانیوں کو کچھ یونہی اکڑا دیتی ہے!! غرض بعض احباب .... نے شرما شرمی ایک آدھ دعوت کر دی، بس غضب کیا تھا، اس چکناؤ کے ملتے ہی آدمیت سے گزر گئے! مگر یارانِ طریقت بھی بلا ہوتے ہیں۔ پھر لنگوٹئے! چھٹی کا لکھا یا تک یاد دلادیں! مختصر یہ کہ ایک شان و شوکت والی پارٹی میں جہاں موصوف بھی شمع محفل بنے ہوئے تھے دو پرانے جا ئیاؤں نے آہی لیا! اور عین اسوقت جب موصوف اپنی احوالی سرگزشت میں یوں منہمک تھے:۔

"حضرات! لندن ہو، پیرس ہو یا کلیفورنیا، ایسے پیارے مقامات ہیں! کہ دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہاں جسے دیکھئیے اخلاق کا پتلا، ایمان کی یہ ہے وہاں ہر شخص نے میرے قدم لئے اور میری بڑی آؤ بھگت کی! آپ کا اصرار ہے۔ میں آپ کے سامنے وہاں کے حالات بیان کروں۔ میں نہیں سمجھتا اس سے زیادہ بھی کچھ اور کہا جا سکتا ہے!............ وغیرہ وغیرہ"

ان میں سے ایک صاحب اس نادر اور دلچسپ گل فشانی پر جب نہ رہ سکے تو آگے بڑھ کے فرمانے لگے :۔

"حضرات! آپ کو شاید اس بات کا احساس نہیں، مسٹر خواہ مخواہ کا لکچر جس درجہ پر از معلومات ہے اتنا ہی دلچسپ بھی ہے! میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ موصوف کا جوش بیان اور آپ حضرات کا انہماک اس درجہ بڑھ گیا ہے کہ طائر شب رنگ موصوف کے کان لے اڑا! مگر نہ موصوف کو ہی اس کی خبر ہے، نہ آپ حضرات کو!" یہ سننا تھا کہ بچارے خواہ مخواہ کے ہوش اڑ گئے، ساتھ ہی ایکدم سے ہاتھ کانوں کی طرف اور آنکھیں آسمان کی طرف اٹھ گئیں! سامعین گو معززین تھے، مگر انسان تھے! یوں پہلے ہی سے وہ بہت کچھ بھرے بیٹھے تھے۔ لیکن اس واقعہ کی گدگدیوں نے بے قابو کر دیا! خلاف متانت لوٹ لوٹ گئے۔ چاہے اس بات سے ہی ہمارے دوست کو کان ہوئے ہیں! تو یہ بات نام کو بھی۔ کیونکہ آپ اس واقعہ بھر کو خیر سے اپنی ہر دلعزیزی کی نشانی سمجھتے رہے! میں نہیں سمجھتا' ان کے قابل .... پاک روحیں باوقار......... کی ان متین حرکات سے کس درجہ خوش ہوتی ہوں گی!

.................' کا وظیفہ اکثر کامیاب ہوتا اور خوب کامیاب ہو جاتا ہے۔ اس کی پہلی کامیابی تو غالباً یہ ہے کہ آپ ہند بدر ہوئے! دوسری مرتبہ اسکے آثار قبولیت شاید اس وقت ظاہر ہوئے جب آپ "سفارش نگر" میں ایک معزز عہدے کی نامور کرسی پر رونق افروز ہوئے!

غرض کہاں تک آپ کے اوصاف حمیدہ کی چینی چی جائے۔ آپ کا وجود تو سراپا تودۂ اوصاف ہے! پھر اس پر جناب کی "عقل و دانش" کے چار چاند! عجب نہیں جو یہاں سے قارئین کرام کا رشک حسد کی صورت اختیار کرنے لگے! مثال کے طور پر ایک اور واقعہ عرض کرتا ہوں۔ یہ بچا سعدی کے "دروغ مصلحت آمیز" والے اصول کے مفہوم سے متعلق ہے۔ یعنی......... صاحب اس گوشت پوست کے کوہ ہمالیہ سے بیزار ہو گئے تھے۔ اور بالکل یقینی تھا کہ "سفارش نگر" کی رعایا، برایا، ان کے وجود سے ہمیشہ کو ترس جائے۔ لیکن موصوف نے ہمیشہ یہی فرمایا کہ......... صاحب سے ملنے کیا آیا، مجھے یہیں روک لیا۔ پھر ایسی محبت ہو گئی کہ چھوڑنے کا نام نہیں لیتے۔ میں سوچتا ہوں' ابا جان کی میراث میں اللہ کا دیا

سب کچھ اترا ہے۔ نوکری کس کے لئے کروں۔ لیکن......... صاحب ہیں کہ ایک منٹ جدا ہونے نہیں دیتے۔ عجب مشکل اور مجبوری ہے۔ یاران طریقت نے جو یہ سفید جھوٹ سنا، تو فوراً سمجھ گئے کہ یہ ساری تمہید حفظ ماتقدم سے زیادہ نہیں! یہ ڈپلومیٹک جھوٹ حقیقت یہ ہے جیسا چاہے ویسا انہیں راس نہیں آیا کیونکہ......... کی سنگت کی وجہ ہمیشہ "داد مخصوصہ" کی زحمت اٹھانی پڑی۔ تاہم موصوف اپنی اختراع پر نازاں ہیں اور اسکی مشق کرتے رہتے ہیں۔ اردو کو ممنون ہونا چاہئے کہ لغت میں "خواہ مخواہی جھوٹ" کا اضافہ ہو رہا ہے۔ جو اپنی نوعیت و وسعت مفہوم کے لحاظ سے بدارج "سفید جھوٹ" سے بڑھا چڑھا ہوگا!

لاحول ولا سادی باتیں کہہ رہا ہوں۔ لیکن موصوف کی ترقی کا اصلی گر اب بھی بیان سے رہا جاتا ہے۔ آپ کا ذریعۂ ترقی بقول چند محبان خاص "منفی سیڑھی" سے بخوبی واضح ہو سکتا ہے! جس میں ہر دو اصناف کے ڈنڈے لگے ہوئے ہیں! صنف قومی کے متعلق ہمیں یہ تفصیل ملی ہے کہ اسمیں صرف ایسے مردان کار شریک ہوتے ہیں؛ جو بقول لیکہ "صنف مشترک کے" خصائص رکھتے ہوں! اس فطری رعایت سے ظاہر ہے مسٹر خواہ مخواہ کی ترقی حق المحنت بنجاتی ہے۔ مگر موصوف کا ایثار دیکھئے کہ وہ اسکے بھی روادار نہیں! کیونکہ وہ اسے نری رعایت سمجھتے ہیں۔ جو اتفاق سے ایک تو......... دوسرے حق الخدمت بنگئی ہے!

کالج والے عقیقہ میں جو انکا نام "میاں ملغمی" پڑا تو وہ خرگوش کے کان، بٹیئے کی تو ند اور ضرب المثل جانور کی بیوقوفی کی طرح ہر وقت کا انکا ساتھی ہوگیا تھا! لیکن سب کو حیرت تھی کہ مسٹر خواہ مخواہ تو سانس کے ساتھ جون بدلکے گویا منٹ منٹ از سر نو تولد ہو رہے ہیں! بریں ہم ان کا کوئی عقیقہ ہوتا ہے اور نہ کوئی سہانا نام تجویز کیا جاتا ہے! آپ اندازہ کیجئے کہ اس بات نے ان کے محبان خاص کو کس درجہ کانٹوں پہ کھینچا ہوگا۔ سنا ہے اس فکر میں ان بیچاروں کا کھانا پینا تک چھوٹ گیا تھا۔ مگر سچ ہے جو ڈھونڈے گا سو پائیگا۔ بالآخر محنت ٹھکانے لگی۔ اور یہ عظیم مہم سر ہوگئی!

ایک دوست کی تقریب شادی ہے۔ جہاں علیگوں کی ریل پیل ہے۔ ایک دالان میں میاں خواہ مخواہ بھی چبوترہ بنے بیٹھے ہیں! جس پر احباب کی ظریفانہ نظریں پڑ پڑ کر پھسلی جاتی ہیں! کچھ دیر بعد برات روانہ ہوئی۔ اور ہمارے دوست خواہ مخواہ سب کے آگے آگے چلنے کی مصیبت میں گرفتار ہوگئے

سچ بھی ہے ایک مصری اہرام پر آپ یا اللہ میاں گزی کا پتلون' فرتوت ہیٹ اور جھول نما کوٹ منڈھ کر فرمائیں کہ تو چل بھی! تو یہ نری ستم ظریفی اور سر تا سر ظلم ہے!! پھر اس پر یہ عذاب مستزاد ہو کہ دمبدم پھبتیوں کا بوجھ لاد دیا جائے! ہاں تو' مسٹر خواہ مخواہ پاکوب ہیں اور آوازے اور پھبتیوں کے گوناگوں تحائف ان کی خدمت میں پیش ہوتے جاتے ہیں! مگر میں اتنا ضرور کہونگا کہ سارے تحائف اوپری دل سے پیش ہوئے! جو باوجود جامہ زیبی موصوف پر کھلتے ہی نہ تھے! ایک پرانے عقیدت کیش بھی اس فکر و کاوش میں منہمک ساتھ ساتھ تھے۔ انہوں نے سوچ سانچ کر بالآخر ایک جچا تلا آوازہ کس ہی دیا! جو چاند ماری کی کامیاب گولی کی طرح موصوف کی " بلز آئی " پر جا کے لگا! فرماتے ہیں " ذرا جلوس کے ہاتھی کی بہار دیکھنا!" بات عقیدت کے ہونٹوں سے نکلے اور قبول و شہرت کے کوٹھوں نہ چڑھے کیا معنی؟ جبکہ وقت و مقام کے رعایت شامل حال ہو۔ چنانچہ برات کے مقام مقصود تک پہنچتے پہنچتے یہ بھاری بھرکم اور سریلے الفاظ ہر کس و ناکس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔ اور یقین ہے جو آئندہ رسم عقیقہ تک یونہی گونجتے رہیں گے!

خیر! غرض یہ موصوف کا عقیقہ ثالث ہے۔ جسکی تقریب و تعارف اس خاکسار کے سپرد ہوئی ہے۔ اور گو میرا دستِ شوق اب موصوف کے کانوں تک نہ پہنچے تاہم آواز مبارکباد پہنچا دینا مناسب سمجھتا ہوں۔ ساتھ ہی یہ بھی عرض کرونگا۔ کہ " میاں ملغبی " کے خطاب کے تحت جو فرائض اور ذمہ داریاں عاید ہوتی تھیں " جلوس کے ہاتھی " کے خطاب کے بعد ان کی معراج ہو جاتی ہے! اب آپ کی سعادت و فرض شناسی کو دیکھنا ہے کہ وہ سماجی مذاق و تفنن کو آپ کے " فیل وجود " پر کس کس طرح سواری کسنے کا موقع دیتی ہے!!

وما علینا الا البلاغ

" میر مخفی "

ڈیرہ دون اور سہارنپور کے خوش ذائقہ چاولوں کے شوقین حضرات حافظ منظور احمد (علیگ) سے " رائس سپلائی ایجنسی " سہارنپور کے پتہ پر خط و کتابت فرمائیں۔

یادِ ایّام

بخدمت جناب مدیر "اولڈ بوائے"

ڈیر منظر!

"اولڈ بوائے" کو آئے ہوئے کئی دن ہوئے، رسید نہ لکھ سکا۔ شکریہ قبول ہو۔ پرچہ بہت اچھا ہے۔ جس کی صبح بنارس میں ہوئی ہو، اس کی شام حیدرآباد میں بری نہیں۔ مگر کچھ بڑھاپا برس رہا ہے، عالمانہ یبوست غالب ہے۔ ممکن ہے آب و ہوا کا اثر ہو، کیوں کہ حیدرآباد اس وقت مخزن علوم و فنون ہو رہا ہے؛ یا ممکن ہے عمر کا تقاضا ہو۔ مگر اس قید سے "اولڈ بوائے" آزاد ہے۔ کیوں کہ یہ وہ ذات شریف ہیں، جن میں بیس برس کے جوان سے لیکر ستر برس کا بڈھا بھی ڈھونڈئیے تو ملجائیگا۔ مضامین سبحان اللہ! بعض نہایت کاوش و تحقیق کا نتیجہ ہیں۔ باقی سب اپنی اپنی جگہ درست ہیں۔ پرانا رنگ البتہ اگر ہے، تو میر پنجتن کے مضمون میں، بالخصوص ان کے اخیر جملوں میں ہے۔ "بڈھوں کو بچہ بنانا" اور شاید "بچوں کو بڈھا بنانا" دونوں خدمتیں "اولڈ بوائے" کے سپرد ہوں۔ دوسرا فرض تو ادا ہو گیا، مگر پہلا ندارد ہے۔

کل ایک صاحب نے پوچھا کہ "اولڈ بوائے" نے اپنے مقاصد تو بہت سے بیان کئے ہیں، لیکن وہ ترکیب کونسی ہے جس سے اسکے ایسے مضامین، جو خاص کر کالج اور کالج لائف سے متعلق ہوں، دلچسپ و شگفتہ

اور آئندہ بکار آمد ہوں۔ میں نے عرض کیا کہ میرے ذہن میں دو باتیں آتی ہیں۔ ایک یہ کہ جہاں کہیں اولڈ بوائز (بالخصوص ایک ہی زمانہ کے) دنیا کی فکروں سے آزاد ہو کر جمع ہوں، اُن میں جا بیٹھئے، اور اسوقت جو باتیں آئیں ہوں انھیں لکھتے جائے، پھر دیکھئے کیا اچھا مضمون نکل آتا ہے۔ مگر اسکا خیال رہے کہ ذرا دُور بیٹھیں، ورنہ شورِ عنادل میں کان پڑی آواز نہ سنائی دیگی۔ دوسرے یہ کہ اگر کوئی "طفلِ کہن سال" دنیا کے "کرکٹ فیلڈ" سے مفرلے کر جہاں کا تھا اُدھر آنکلے تو اسکے ہمرکاب ہوجائے۔ اور وہاں کے چپے چپے پر جو کیفیتیں وہ محسوس کرے اُسے نوٹ کر کے تک بندی شروع کر دیجئے، پھر دیکھئے کیا لاجواب مضمون نکلتا ہے۔ جسے گانا نہ آتا ہو وہ بھی پڑھ کر گنگنانے لگے۔

مسٹر مدیر! میں آپ کو خط لکھنے تو بیٹھ گیا، لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا لکھوں، ذہن خالی ہے اور بکواس ضروری۔ آپ اور میں دونوں علیگڈھ کالج کے ہیں، جہاں نئی تہذیب خاص طور پر سکھائی جاتی تھی مگر میں آپ کو بزرگوں کی ہم مکتبی کا حال سناؤں جو پرانی تہذیب کے لوگ گذشتہ صدی عیسوی کے اوائل میں متعلم رہے تھے۔ ۴۰ برس سے زیادہ ہوئے کہ دہلی میں ایک نکاح کی محفل میں پرانے دہلی کالج[1] کے "اولڈ بوائز" کا ایک مجمع نظر سے گذرا تھا۔ یہ سب اس کالج کے اورنٹیل ڈپارٹمنٹ میں طالب علم رہ چکے تھے۔ ان میں پانچ چھ بزرگ ایسے بھی تھے جو بعد کو شمس العلما ہوئے۔ خدا غریق رحمت کرے ان سب کو۔ اب ان میں ایک بھی زندہ نہیں ہے۔ جن کے مکان پر یہ مجمع ہوا تھا وہ بھی دلی کالج کے اولڈ بوائے تھے، اور نکاح بھی ان ہی کے لڑکے کا تھا جو آیندہ علی گڈہ کا اولڈ بوائے ہوا۔ واللہ ان کے عرض میں یہ سب بزرگ ایک ہی طرف مل کر بیٹھے۔ دوسرے کی ہمت نہ تھی کہ ان کی جماعت میں قدم رکھتا۔ سب کے بیچ میں مولوی نذیر احمد مرحوم سرپنچ بنے بیٹھے تھے۔ شاید حیدرآباد سے اسی زمانہ میں قطع تعلق کر کے دلی آئے تھے۔

---

[1] پرانا دہلی کالج ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانہ میں غالباً ۱۸۲۵ء میں قائم ہوا تھا اور غالباً نصف صدی قائم رہکر بند کر دیا گیا یہ سب بزرگ جن کا میں ذکر کرتا ہوں، اس کالج کے مشرقی صیغہ کے طالب علم تھے، اور غدر (۱۸۵۷ء) سے بہت پہلے ہی تعلیم سے فارغ ہو چکے تھے۔ یہ مجمع غالباً دسمبر ۱۸۸۳ء کا واقعہ ہے۔

غرض جب سب صاحب جمع ہولئے تو پھر، جوان بزرگوں میں پرانے قصے، یارانِ عدم رفتہ کی یاد، اور زندگی کے شکوے، مرحوم استادوں کے تذکرے، پرانے لطیفے، پرانی باتیں، دنگے اور شوخیاں، بات بات پر ہنسیاں، یہاں تک کہ پھبتیاں اس بلا کی شروع ہوئیں کہ ساری محفل دنگ رہ گئی۔ محفل میں ایسی قدیم تر تہذیب کے لوگ بھی تھے جنہوں نے سوائے مسجد اور خانقاہ کے کسی انگریزی مدرسہ کی صورت بھی نہ دیکھی تھی۔ انکی نظروں میں یہہ بزرگ ایسے ہی تھے جیسے ہم اپنے بزرگوں کی نظروں میں بعد کو ثابت ہوئے۔ غرض مرحوم دلی کالج کے ان پرانے طالبعلموں نے کوئی چیز اپنے زمانہ کی ایسی نہ چھوڑی جسے غایت درجہ اُنس یا ظرافت کے پہلو سے یاد نہ کیا ہو۔ یہاں تک کہ اس خونچے والے کا بھی ذکر آیا جس سے مدرسہ میں سودا لے کر کھایا کرتے تھے۔ ایک صاحب بولے کہ دریبہ میں اب بھی اسکا پوتا خونچہ لگاتا ہے۔ دوسرے بولے کہ ہمارا یار چندو لال تو لاہور سے جب دلی آتا ہے اسی سے منگوچیاں لے کر کھاتا ہے۔ مولوی نذیر احمد بولے کہ تم سب چٹور ے تھے۔ یہاں جیب میں دام ہی نہ ہوتے تھے کہ چکوتھیاں کرتے۔ شدہ شدہ حیدر آباد کا ذکر آیا۔ پھر تو مولوی صاحب نے وہاں کے دفاتر کے معائنوں اور ملازمت سے اپنے علیحدہ ہونے کے قصے اس لطف و بے تکلفی سے بانگِ دہل میں فرمانے شروع کئے کہ ایک ایک قہقہے پر سارا مکان لرز اٹھتا تھا۔ باقی جس قدر حاضرین تھے حیرت میں تھے، اور کہتے تھے کہ خدا اُن کو سنوارے یہ شہر کے مولوی اور منشی ہیں یا ٹھٹھکڑ۔ اس علم و فضل پر ان کو کیا ہو گیا ہے؟ جب تک محفل بیٹھی رہی یہی رنگ رہا؛ اور ختم ہونے پر دلی کالج کے یہ پرانے لوگ آوازمیں ایک سوز کے ساتھ یہ کہتے ہوئے اٹھے کہ "جب سے کالج چھوٹا تھا اتنے ہم مکتب کبھی پہلے ایک جگہ جمع نہ ہوئے تھے، اور نہ شاید پھر کبھی ہوں"۔ غالباً یہی ہوا بھی۔

مسٹر منتظر! یہ وہ اسلاف تھے، جن کے اخلاف میں ہم علی گڈھ کے نام لیوا اولڈ بوائز ہیں۔ مجھے اُس وقت کی باتیں اب پوری یاد بھی نہیں، مگر ان سب کی گفتگو ذہانت اور ظرافت کا ایک عجیب نمونہ معلوم ہوتی تھی؛ اور سب سے زیادہ لطف یہ تھا کہ اس بڑھاپے اور بزرگی میں وہ بالکل بھولے بھالے مدرسہ کی باتونی لڑکے نظر آتے تھے۔ یہ پرانی تہذیب کے لوگ تھے۔ ہماری تہذیب اُن سے زیادہ آزاد ہے، اور جب ہم لوگ مل بیٹھتے ہیں تو بلا نشہ پانی مَن سے بھی بڑھ کر ہوتا ہے۔ بس کاغذ پنسل سے سلح ہو کر

آپ بھی یارانِ طریقت میں کسی ایسے ہی موقع پر پہنچ جائے، اور پھر وہاں کی تصویریں الفاظ میں اُتار کر "اولڈ بوائے" میں شائع کیجیے! یا جیسا کہ میں نے اوپر لکھا ہے اس سے بھی زیادہ پر اثر وہ کیفیت ہوتی ہے جب کوئی اولڈ بوائے بڈھا ہوکر کالج میں آنکلتا ہے۔ کبھی اسکے رپورٹر بن کر بھی ساتھ ہو لیجئے۔ یہ کیفیت کسی ایک ملک کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، بلکہ ہر جگہ کم و بیش ایک سا حال ہے۔ کچھ عرصہ ہوا علی گڈھ کے ایک صاحب ولایت سے تعلیم پاکر آئے، تو انہوں نے اکسفورڈ کا ایک قصہ سنایا۔ قصہ انہوں نے انگریزی میں بیان کیا تھا، جس کا لطف ترجمہ میں کہاں آسکتا ہے، پھر بھی سننے کے قابل ہے۔ آکسفورڈ کے ایک مُسن اولڈ بوائے اتفاق سے اپنا پرانا کالج دیکھنے آئے، دُور ہی سے عمارت کو دیکھ کر حسرت سے کہنے لگے "وہی پرانا کالج ہے" دروازے سے صحن میں داخل ہوئے تو فرمایا "وہی پرانا صحن ہے" آگے بڑھ کر ایک کمرے میں پہونچے تو کہنے لگے "وہی پرانا کمرہ ہے" کمرے میں کتابیں دیکھ کر بولے "وہی پرانی کتابیں ہیں" کمرے کے ایک گوشہ پر نظر پڑی تو وہاں طالب علم کے پاس ایک نوعمر حسین لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔ دیکھ کر مسکرائے اور فرمایا "وہی پرانا قصہ ہے"۔ طالب علم کو یہ جملہ ناگوار گذرا۔ کہنے لگا، "ہائیں! آپ کیا سمجھ رہے ہیں۔ یہ تو میری بہت قریب کی عزیز ہیں"! اولڈ بوائے صاحب، سن کر ہنسے اور گردن ہلاکر بولے "وہی پرانا عذر ہے"۔

اخیر کے دو جملوں کو چھوڑ کر جسکی نوبت ابھی اس ملک میں نہیں آئی ہے، اس کل قصے سے ظاہر ہے کہ جہاں لڑکپن اور جوانی بے فکری میں بسر ہوئی ہو، اسکو زیادہ عمر میں دیکھئے تو بیچ کا فصل معدوم ہوجاتا ہے، اور انسان تھوڑی دیر کے لئے پھر اسی زندہ دلی کے وادیٔ نشاط میں جا بستا ہے۔ تھوڑا عرصہ ہوا کہ میں بھی برسوں کے بعد علی گڈھ گیا تھا، دو دن رہا! کیا بتاؤں کہ اس قلیل مدت میں قلب کی کیا حالت رہی۔ کالج کی عمارتوں اور باغوں میں لاوارثوں کی طرح پڑا پھرا۔ میرا جاننے پہچاننے والا کوئی نہ تھا۔ ایک ایک چیز کو دیکھ کر میری زبان پر بھی، وہی " ہمانست کہ بود " کی گردان اکسفورڈ کے اولڈ بوائے کی طرح آنے لگی قدم قدم پر خدا جانے کب کی بھولی بسری باتیں یاد آتی جاتی تھیں۔ گذری ہوئی صورتوں اور نقشوں کا ایک ہجوم تھا جو ذہن میں اترتا اور دوسروں کو جگہ دینے کیلئے مٹتا چلا جاتا تھا۔ اس کو خود غرضی سمجھئے یا مقتضائے فطرت، کہ جتنے لوگ یاد آئے یا جن مکانوں کو دیکھا یا اُن کے نشان تلاش کئے، وہ سب اپنے ہی

زمانے کے تھے۔ کوئی رنگ، کوئی بو، کوئی پھول اس گلزارِ طفلی کا ایسا نہ تھا جو یاد نہ آیا ہو۔ مگر سب اپنے وقت کی چیزیں۔ پھر بھی اتنا ضرور تھا کہ جس کمرے کو دیکھتا تھا، وہ بہت کچھ اپنا ہی کمرہ معلوم ہوتا تھا، اور جس طالبِ علم پر نظر پڑتی تھی اس میں بہت کچھ میں خود ہی نظر آتا تھا۔ یہ وہ مقام تھا جہاں کبھی سب مل کر رہتے تھے۔ اب کوئی کہیں ہے کوئی کہیں۔ ہر ایک دنیا کی مکروہات میں مبتلا ہے اور "اولڈبوائے" سے کہہ رہا ہے "اللہ کچھ فرمائے جائے۔ ع

ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے

جی چاہتا ہے کہ اسی بے فکری کی زندگی کو کالج ہی کے در و دیوار کے سایہ میں پھر کوئی زندہ کر دکھائے۔ اولڈبوائز کو اگر توجہ ہو تو اپنے اپنے زمانہ کے دوستوں اور استادوں کا حال لکھ کر انکے اخلاق و کرم، تادیب و سلوک کو یاد دلا سکتے ہیں۔ کھیلوں اور مشغلوں کا ذکر کریں۔ آپس کی چہلیں اور شرارتیں، مگر بڑوں کا ادب، چھوٹوں کا لحاظ رکھ کر لکھیں۔ جس جس طرح اپنی عمریں ضائع کی ہیں اس پر بھی کفِ افسوس ملتے جائیں۔ دل میں شکر ہو اور طبیعت میں گداز۔ کالج کی عمارتوں، باغوں اور زمینوں کا حال بھی ضرور ہو۔ جب یہ تمام کیفیتیں اور منظر مختلف وقتوں کے مختلف اولڈبوائز کے لکھے ہوئے آیندہ زمانہ میں کسی مورخ کے سامنے آئیں گے، تو وہ بقید وقت کالج اور کالج لائف کے مکمل حالات بیان کر سکے گا، اور سر دست آپکے پرچے کے لئے بھی ذخیرہ کافی مہیا ہوتا جائے گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اولڈبوائز دائرکٹری کی تیاری میں آپ ان باتوں کی طرف بھی اولڈبوائز کو توجہ دلاتے رہینگے۔ اب کیا عرض کروں، فی امان اللہ۔

۱۵ر دسمبر ۱۹۲۶ء۔ خاکسار

محمد عنایت اللہ

جناب مولوی محمد عنایت اللہ صاحب کے ہم شکرگزار ہیں کہ ہمارے لئے یہ مضمون لکھنے کی تکلیف گوارہ فرمائی۔ رسالہ بچوں کا بھی ہے، اور بوڑھوں کا بھی؛ اور یہی اس کا مدعا ہے کہ بوڑھوں میں جوانی کی روح

باقی رکھے۔ اولڈبوائز میں دو باتیں خاص ہیں۔ ایک تو کالج سے الفت، دوسرے آپس میں محبت۔ ان دو کے سوا ذوق کا اختلاف، عمر کا تفاوت، اور حوالی کا اثر سب پر جدا جدا پڑتا ہے۔ کھلنڈرے کھیل کے ذکر کو پسند کرتے ہیں، اور پڑھنڈرے یہ چاہتے ہیں کہ کتاب کے کیڑے بنے رہیں۔ اس مرتبہ کثیر التعداد پڑھنڈرے بھائیوں کی فرمائش پر اُن کی دلچسپیوں کا سامان بھی کیا گیا ہے۔ مولوی صاحب نے ایک خاص مضمون کا وعدہ فرمایا ہے۔ ہم اُن کے موعودہ مضمون کا انتظار بے قراری کے ساتھ کرتے رہیں گے، اور شکرگزاری کے ساتھ شائع کریں گے۔ اولڈبوائے

برادرم "وفا" کو "قدردانِ دیور" کی رسید میں ہم نے لکھا تھا، کہ مضمون دیکھتا ہوں تو کباب کھانے کو جی چاہتا ہے، اور کباب کھاتا ہوں تو مضمون یاد آجاتا ہے۔ اس کے جواب میں لکھتے ہیں کہ "کباب کھانا کیا دشوار ہے؟ صحیح جستجو اور حقیقی طلب درکار ہے

شرط اول قدم آنست کہ مجنوں باشی

آپ تو کباب والے اولڈبوائے سے بہت قریب ہیں۔ اتا پتا یہ ہے! کوتاہ قامت، دبلے پتلے، دراز بینی، سفید رنگ، ڈاڑھی منڈاتے ہیں، مونچھیں کترواتے ہیں، فوجی عہدہ دار ہیں، دو لڑکیوں کے والد اور ایک بی بی کے شوہر ہیں، اور بڑے مشہور شخص کے داماد ہیں۔ مکان اُنکا آل سینٹ چرچ کے مغرب میں، اسٹیشن ریلوے کے مشرق میں، فتح میدان کے جنوب، اور کلکنڈی کے شمال میں واقع ہے۔ علاوہ فرائض سرکاری کے گھر سے باہر کم جاتے ہیں، لیکن کبھی کبھی کرکٹ فیلڈ وغیرہ پر نظر آجاتے ہیں۔ نام اُنکا ایک بڑے مشہور شاعر کا نام ہے، اگرچہ وہ شاعری سے زیادہ رغبت نہیں فرماتے۔ راہ طلب میں بسم اللہ کر کے قدم رکھئے، آپ کو بھی کباب مل جائیں گے"۔ ہم اپنے پوسٹمین بھائی کو یقین دلاتے ہیں کہ ان بزرگوار کا پتہ مل گیا، اور عجیب اتفاق ہے کہ کرکٹ فیلڈ ہی پر نظر آئے۔ کباب بھی کھلانے کا وعدہ کیا، اور چار خریدار اولڈبوائے کے لئے نقد دیدئے۔ ڈائرکٹری کے لئے حالات بھی دیں گے، اور رسالہ کے لئے لطیفے بھی۔ اب اور کیا چاہئے۔

اولڈبوائز

ا۔ اعلیحضرت حضور پر نور خلد اللہ ملکہم نے ازراہِ مراحم خسروانہ امیرزادگان پائیگاہ میں سے نواب خیر نواز جنگ بہادر، نواب حسن یار جنگ بہادر، اور نواب وحید یار جنگ بہادر فرزندان نواب سلطان الملک بہادر کے نام ماہوارات و معمولات کا اجرا فرما کر ہمارے ان بھائیوں کو سرفرازی کا موقع عطا فرمایا ہے۔ یہ ہرسہ نواب معہ دیگر اعزہ کے "پائیگاہ ہوس" علیگڈھ میں مقیم اور ہمارے اسکول میں مدت ہوئی زیر تعلیم تھے، اور وہاں سے جناب مولانا گاندھی جی صاحب اعلی اللہ مقامہ کے تشریف فرماے علیگڈھ ہونے پر حیدرآباد طلب فرمالئے گئے۔ نواب خیر نواز جنگ بہادر اب متاہل زندگی بسر فرما رہے ہیں، اور ایک فرزند کے باپ ہو چکے ہیں۔ نواب حسن یار جنگ بہادر نے گزشتہ امتحان انٹرمیڈیٹ میں ہمارے کالج سے کامیابی حاصل کی تھی۔ اب پائیگاہ کی تاریخ اُن کے زیر نظر اور زیر تصنیف ہے۔ نواب وحید یار جنگ بہادر خاموش زندگی گزار رہے ہیں۔ ہم ان ہرسہ حضرات کو دلی مبارکباد دیتے ہیں۔ اولڈبوائے کے پہلے نمبر کو دیکھ کر نواب حسن یار جنگ بہادر نے حوصلا افزا الفاظ میں ہمیں یاد کیا تھا۔ فرماتے ہیں!

"آفریں ہے آپکی ہمت پر کہ آپ نے اس ستارہ کو پھر پرتو فگن کر دکھایا۔ دعا ہے کہ خدا آپ کے ارادوں میں کامیابی دے، اور "اولڈبوائے" نئے سرسے پھولے پھلے۔ آپکا اولڈبوائز وائرکٹری شائع کرنے کا خیال بھی نہایت قابل تحسین ہے۔ یہ ایک بہت بڑا کارنامہ اور علیگڈھ اولڈبوائز پر احسان عظیم ہوگا۔ ضرور شائع کیجئے۔ میں حتی الامکان آپ کی مدد کرونگا۔"

۲۔ مخدومی و مکرمی مولوی ابوالمحسن صاحب (ہمارے سابق اسسٹنٹ سکرٹری) نے گذشتہ حج بیت اللہ کے موقع پر اللہ میاں کی برات دیکھی تھی۔ گھر واپس ہوئے تو فرزند ارجمند مسٹر حسن عبد اللہ کی تقریب شادی کے وقت اس نمونہ کو چھوٹے پیمانہ پر دیکھنے کے خواہشمند ہوئے۔ یہ شادی، ۱۱ نومبر ۱۹۲۶ء کو قرار پائی تھی، اور چودہ ہزار مہر پر دلہن، دولہا کی ہو گئی۔ کہتے ہیں کہ براتیوں کی کثرت کے باعث چودہ موٹر لاریاں مولوی صاحب کی جانب سے ناہموار سڑکوں پر دن رات کام کرتی رہیں۔ ہم دولہا کی ہمت عالی سے اسلئے خوش ہوئے کہ باپ سے مہر ادا کرنے کے باب میں صاف صاف کہدیا، کہ خود اپنی محنت کے پیسہ سے ادا کریں گے۔ خدا اس تقریب کو میاں بی بی اور سارے خاندان کیلئے مبارک کرے۔

۳۔ ڈائرکٹری کے لئے اپنے حالات روانہ کرتے ہوئے ہمارے بھائی "چوکیدار" تعلیمی زمانہ کے خصوصیات میں تحریر فرماتے ہیں، کتابیں پاس نہ تھیں، پڑھنے کے لئے وقت نہ تھا۔ بزمانہ کالج روشنی کے لئے لیمپ تک نہ تھا۔ جب شاہ منیر عالم صاحب چالیس بتیوں کی قوت کا لیمپ لے کر قریب میں آکر رہے تھے تو چند طلبہ ملکر بازار سے کرایہ پر متعدد لیمپ لائے تھے۔ کھانے کے کمرہ کی میزیں نکالکر کمرے کے سامنے سجاکر ان کے پڑھنے کا مقابلہ کیا تھا۔ آخر کار نواب محسن الملک مرحوم نے ان کو بنگلہ میں بھیجدیا، اور روشنی اور محنت سے نجات ملی"۔ اب ان حضرات کے پڑھنے کی کیفیت بھی سنیئے: "گپ، پھرنا، کالج کا کام مثلاً جب کوئی بڑا آدمی آئے کالج سجانا، پارٹیوں کا انتظام، کورس میں حصہ لینا، پڑھنے سے بھاگنا۔ انٹرنس سکینڈ ڈویژن میں پاس کیا، حالانکہ جغرافیہ کے دن دہلی تماشہ دیکھنے چلا گیا تھا۔ انگریزی ترجمہ میں ہمیشہ اول نمبر رہا، مسٹر مارسین بھی سب سے زیادہ ترجمہ میں نمبر دیتے تھے۔ ریاضی میں صفر کے سوا کسی نے ایک نمبر بھی نہ دیا! تین مرتبہ فرسٹ ایر میں شریک ہوا، سکینڈ ایر میں پہنچا۔ پر کوئی دوست (غالباً منظفر محمد خاں بی اے ڈپٹی کلکٹر......) فرسٹ ایر میں اسکول کے زمانہ کے تھے، ان کی فرمائش پر عرضی دیکر فرسٹ ایر میں آ گیا"۔ یہ اس شخص کی کہانی ہے، جو بعد کے زمانہ میں اول درجہ کا مجسٹریٹ ثابت ہوا۔

۴۔ مکرمی ڈاکٹر مرزا احسن علیخاں کھلانے کے وقت، اور کھانے کے موقع پر انداز تشکر میں اپنے بہت سے دوستوں سے جدا ہیں۔ ولایت میں ڈاکٹری کا امتحان پاس کیا، تو دوستوں کی فرمائش ہوئی کہ

حضرت دعوت ؟ سنگ آمد و سخت آمد کہہ کر تیار ہو گئے۔ بہت سے انگریزی اور مغلئی کھانے پکوائے، اور بادام کا حلوا شائد خود بنایا۔ کھانے والوں نے حلوے کی بہت تعریف کی، اور سب سے زیادہ یہ بات پسند آئی کہ ڈاکٹر نے کچھ سوچ سمجھ کر کھلایا ہوگا۔ شاید اس موقعہ کے شعر کو سن کر، نہیں! غالباً ترقی کے موقعہ پر برادرم آغا حیدر حسن کے دل میں بھی گدگدی اٹھی اور اپنے دوستوں کو خشک دعوت دیدی۔ (آپ خشک کی دعوت نہ سمجھیں) ڈاکٹر حسن سلیماں کی قسمت میں سیب و انگور آئے؛ مگر لطف یہ ہے کہ آغا حیدر بھی دسترخوان پر ڈٹے ہوئے ان میں برابر کے شریک بن گئے۔ اس موقع پر ڈاکٹر صاحب نے چار مصرعوں سے آغا کی تواضع فرمائی۔ کہتے ہیں۔

آج صاحب نے جو بھیجے ہیں یہ سیب و انگور — بادۂ ناب سے ہر ایک ہے ان میں معمور
بھیجنے والے نے کیا جانئے کیا سحر کیا — دیکھتے دیکھتے ہو جاتی ہیں آنکھیں مخمور

ہم تو یہ جانتے ہیں کہ دونوں کے دل بادۂ محبت سے معمور ہیں، ورنہ سیب و انگور میں کیا دھرا ہے۔ یہ مثال شکر گزاری کی تھی۔ اب ایک نمونہ ناشکری کا بھی ملاحظہ فرمائیے۔ برادرم قاضی تلمذ حسین صاحب ایم۔اے اپنے دوستوں کو جمع کرنے اور اُن کو کھلانے پلانے کے بہت عادی ہیں۔ اس قسم کی مدارات میں زیادہ تر مودودی، منظر، جوش، اور سعیدان اکثر قاضی صاحب کے شکار ہو جایا کرتے ہیں۔ ان لوگوں کی خاطر بیچارے کبھی اپنی انگلیاں بھی جلا لیتے ہیں۔ کھلاتے ہیں اور زیادہ کھانے کا اصرار کرتے ہیں۔ پلاتے ہیں، اور کہتے ہیں اور پیو۔ ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ اوپر کے چار درویشوں میں سے تین قلندر قاضی صاحب کے یہاں مدعو تھے۔ سب نے پیٹ بھر کر کھایا، اور سیر ہو کر پی۔ میزبان کا اصرار اس کے بعد بھی باقی رہا۔ حضرت جوش کو جوش آگیا، اور فرمانے لگے۔

قاضی صاحب کی چاء پیتے ہیں — پھر بھی حیرت ہے لوگ جیتے ہیں

قاضی صاحب نے منہ بنا کر 'جیتے' کی جگہ 'مرتے' بنا دیا۔ انھیں یہ خبر نہیں کہ اُن کے بہت سے دوست انکی انھیں اداؤں پر تو مرتے ہیں۔ اس مرنے پر بھی شاعر کا شعر ہو گیا، اور پہلے شعر کے لگ بھگ ہوا، مگر ہم بھول گئے۔

۵۔ برادرم مسٹر سعید احمد صدیقی، اور عزیزی سید فائق حسین دونوں ہماری دلی مبارکباد قبول کریں! کہ اول الذکر تحصیلداری حضور آباد سے مددگاری مال ضلع کریم نگر پر، اور آخر الذکر تحصیلداری

پالونچہ سے ضلع ورنگل کی مددگاری مال پر مامور ہوئے ہیں۔ مسٹر فائق حسین اس لحاظ سے بھی لائق مبارکباد ہیں کہ خداوند عالم نے انھیں فرزند نرینہ عطا فرمایا ہے۔ ہم ان کی اس محبت کو ہمیشہ یاد رکھیں گے کہ جب ہم نے رسالہ اولڈ بوائے کی اشاعت کا اعلان اپنے احباب و اعزہ میں کیا تو سب سے پہلے انھیں نے ہماری جانب دست امداد بڑھایا تھا۔ سچی محبت بڑی قدر کی چیز ہوا کرتی ہے' اور فائق اس باب میں پورے ہیں۔

۶۔ مولوی مسعود علی صاحب بی۔ اے (علیگ) خود تو ہمارے کالج کے فرزند رشید تھے ہی انہوں نے اپنی اولاد کو علیگڈہ کی برکتوں سے فیضیاب کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ مسٹر رشید احمد ایم۔ اے ایل ایل بی' اور مسٹر سعید احمد صدیقی ایچ۔ سی۔ ایس ان کے دو لائق فرزند ہمارے اس بیان کے گواہ ہیں۔ باقی اولاد میں سے مسٹر حبیب احمد نے بھی اس برکت کو حاصل کیا ہے۔ ہمارے برادر محترم نے حال میں اپنے انھیں فرزند کی شادی رچائی تھی' اور سنتے ہیں کہ یہ غیر معمولی دہوم سے ہوئی۔ ہم نوشاہ اور ان کے پدر بزرگوار دونوں کو مبارکباد دیتے ہیں۔

۷۔ ولایت سے واپس آنیوالوں کے باب میں ہم نے گذشتہ اشاعت میں وعدہ کیا تھا کہ آئندہ تفصیل عرض کریں گے۔ اب ہمیں معلوم ہوا ہے کہ مسٹر سید اعظم الدین حسن بلگرامی اسکول آف اکنامکس و پولٹیکل سائنس لندن میں زیر تعلیم تھے۔ اس اسکول کا تعلق وہاں کے سررشتہ ریلوے سے ہے۔ مسٹر اعظم بلگرامی نے اسکول کے اکنامکس و اکاونٹ کے امتحان میں کامیابی حاصل کی۔ اسکے ساتھ ہی انسٹی ٹیوٹ آف ٹرانسپورٹ سے (جو انسٹی ٹیوٹ آف انجنیرس کے مماثل ہے) وہاں کی گریجویٹ شپ حاصل کرکے ڈپلوما پایا۔ قلمرو آصفیہ کے نوجوانوں میں اسکے لحاظ سے ہمارے بھائی سر خیل ہیں۔ دوران تعلیم میں لندن و شمالی مشرقی ریلوے کے دفاتر میغہ حسابی میں عملی تربیت حاصل کرتے رہے۔ واپسی میں ممالک جرمنی' سوئیزرلینڈ' اٹلی' اور فرانس وغیرہ میں رہتے سہتے وطن واپس آئے۔ اب یہاں اسسٹنٹ گورنمنٹ اڈیٹر نظام گارنٹیڈ اسٹیٹ ریلوے کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ اولڈ بوائے کی توسیع اشاعت میں ہمیں ان سے بڑی مدد مل رہی ہے' اور ہم اس باب میں مسٹر اعظم کے بدل ممنون ہیں۔

ہمیں افسوس ہے کہ گنجائش کی قلت کے باعث بہت سے نوٹ آئندہ نمبر کے لئے ملتوی کرنے پڑے۔

Printed at the Osmania University Press. Hyderabad Deccan.

اُولڈ بوائز ڈائرکٹری

علیگڈھ اُولڈ بوائز!

براہ کرم علیگڈھ اُولڈ بوائز ڈائرکٹری (خزینۃ الکرام) میں اپنے حالات درج کرنے کی غرض سے مندرجہ ذیل سوالات کے جواب عنایت فرمائیں۔

(۱) نام مع ولدیت وسکونت۔ مقام و تاریخ پیدائش۔
(۲) تعلیم کی ابتدا کب اور کہاں ہوئی۔ علیگڈھ میں کس جماعت میں داخل ہو کر کہاں تک تعلیم پائی۔ تعلیم کے زمانہ کے خصوصیات وامتیازات (اگر کچھ ہوں)
(۳) علیگڈھ میں تفریحی مشاغل کیا تھے، اور ان میں کیا نام پیدا کیا۔
(۴) علیگڈھ میں عملی طور پر کن کاموں میں شرکت کا موقع ملا، مع اسکے نتیجہ کے۔
(۵) علیگڈھ سے باہر جا کر کس قسم کی زندگی اختیار کی، اور اس میں کہانتک کامیابی ہوئی۔
(۶) ملک میں یا بیرون ملک کوئی اہم سفر کیا ہو تو اس کا ذکر۔
(۷) ملک کی علمی، ادبی، یا شعری خدمت انجام دی ہو تو اس کا تذکرہ۔
(۸) شادی کب اور کہاں ہوئی۔ اولاد کی تعداد۔ فرزندوں کے نام۔

نیازکیش
سیّد منظر علی

اولڈ بوائے
علی گڈھ

Regd : No M 2335

نشان ٹھپہ سرکار آصفیہ

اولڈ بوائے

نمبر ۶

جلد ۱

فہرست مضامین بابتہ ماہ مارچ ۱۹۲۸ء

تاریخی، تعلیمی اور تفریحی ماہنامہ

علیگڑھ اولڈ بوائز کا ادبی
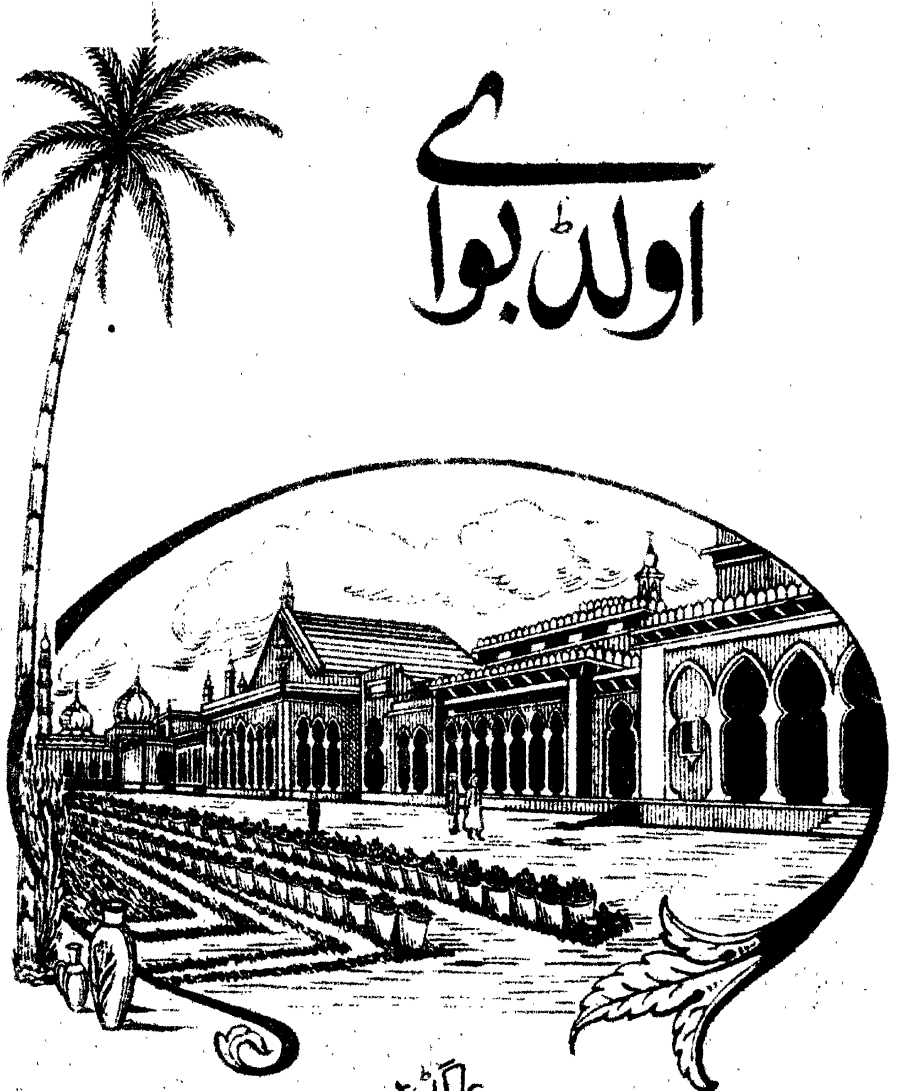
نمبر	مضمون	مضمون نگار	صفحہ
۱	مسلم یونیورسٹی کوآپریٹو سوسائٹی	"نیازمند"	۳
۲	یونان کے جزیرے (نظم)	جناب مولوی محمد عظمت اللہ خاں مرحوم	۱۵
۳	شرح دیوان غالب پر ایک نظر	جناب مولوی سید محمد ضامن صاحب کنتوری	۱۹
۴	آتش جوان تھا!	جناب مولوی محمد احمد صاحب	۲۵
۵	پیام ٹگور	جناب مولوی افضل حسین صاحب فاروقی	۲۸
۶	من کی موج	جناب مولوی سید وزیر حسن صاحب	۳۲
۷	یاد ایام	"وفا"	۳۷
۸	ہمارا کالج	------------------------	۴۱
۹	اولڈ بوائز	------------------------	۴۴

سید منظر علی اشہر مدیر و ناشر نے ۱۲-۴ سلطان پورہ حیدرآباد دکن سے شائع کیا

یہ مسٹر عظمت اللہ خاں بی اے (مرحوم) کی دلچسپ اور انوکھی نظموں کا وہ لاثانی مرقع ہے جسے انکی شاعرانہ عظمت کا صحیح ترجمان کہا جا سکتا ہے۔ مرحوم کی دلرُبا اور نکھری ہوئی نظموں کی ملک نے جسقدر قدر کی ہے اسی بھروسہ پر بصرف زرِ کثیر نہایت اعلیٰ پیمانے پر انکی طباعت کا بھی انتظام کیا گیا ہے اس کا مقدمہ مصنف مرحوم کا خود نوشتہ اور اُردو ادب میں ایک ایسا بے نظیر اضافہ ہے جسنے شاعری میں ایک انقلاب پیدا کردیا ہے۔

جو حضرات کہ سخن سنجی اور سخن فہمی کا ذوق سلیم رکھتے ہیں اور اسبات کے دل سے خواہاں ہیں کہ اب اردو شاعری کا نیا دور شروع ہو ان کیلئے اس مجموعہ اور مقدمہ کا مطالعہ حقیقی مسرت کا باعث ہوگا۔

اس مجموعہ کی مانگ ملک کے ہر گوشے سے ہو رہی ہے آپ اپنا آرڈر ابھی سے بُک کرا لیجئے ورنہ طبع ثانی تک انتظار کرنا پڑے گا۔

فرمایشات ذیل کے پتہ پر روانہ کی جائیں۔

منیجر اولڈ بوائے بُک ڈپو سلطانپورہ حیدرآباد دکن

نواب سر مزمل اللہ خاں بہادر کے نیازمند اور ہمارے مخدوم و مکرم جناب نیازمند (مخلص) نے تحریر ذیل ہمارے پاس درج رسالہ کرنے کی غرض سے روانہ فرمائی ہے۔ اولڈ بوائے کی کوشش یا برادر مکرم مولوی محمد یعقوب صاحب ڈپٹی پریسیڈنٹ لیجسلیٹو اسمبلی، کی صحبت کے اثر نے ...... کے ... دراز مقام سے جناب نیازمند کو اس تکلیف فرمائی کیلئے مجبور کیا، اور ناظرین رسالہ کو علمی سبق حاصل کرنے کی غرض سے انھوں نے اپنے سالہا سال کے تجربات کو "اولڈ بوائے" کے سپرد فرما دیا۔ اللہ کرے، یہ صاحب پھر بھی کبھی کبھی کچھ نہ کچھ لکھتے رہیں بلکہ مولوی محمد یعقوب کو بھی اپنے اس مرض میں شریک فرمالیں۔ ہم مسرت کے ساتھ دوسرے قارئین کرام کے آرا کا انتظار کرتے رہیں گے۔

صاحب مضمون نے اپنی تحریر کے دو حصے کئے ہیں، دونوں ایک دوسرے کے اجمال کی تفصیل ہیں۔ جو خط اس تحریر کے ساتھ شائع کیا ہے ہم چاہتے ہیں کہ ارباب علیگڈھ اس پر توجہ فرمائیں اور ہمیں بتائیں کہ آخر سنہ ۲۷ء سے اب تک عملی طور پر کس قدر کام انجام پذیر ہوا ہے۔ صاحب تحریر نے نہایت قابلیت کے ساتھ اپنے خیال کی توضیح فرمائی ہے اور اگر اس پر توجہ فرمائی گئی تو بہت سے فوائد کی امید کیجا سکتی ہے کیا جناب نواب صاحب یا پرو وائس چانسلر صاحب، یا دونوں صاحبان ان تجاویز کو بغور ملاحظہ فرما کر ہمیں اطلاع بخشیں گے کہ ان امور سے متعلق کیا کیا جا رہا ہے؟

اولڈ بوائے

مسلم یونیورسٹی میں اساتذہ طلباء و عملہ کی ضروریات کے اخراجات سالانہ

(۱) ٹوپی۔ جراب۔ بنیان۔ رومال۔ نکٹائی۔ کالر۔ بٹن۔ پیٹی۔ ہیٹ (Hat) مفلر۔ تولیا۔ گیلس (Braces)، تیل۔ خوشبو۔ کنگھی۔ برش۔ منجن۔ صابن۔ استرہ۔ سپ۔ چاء۔ شکر۔ جیم (Jam)؛ کاغذ۔ قلم۔ روشنائی۔ دوات وغیرہ .... دو لاکھ ستر ہزار

(۲) پارچہ جات پوشیدنی۔ لحاف۔ چادر۔ توشک۔ دری وغیرہ .... تین لاکھ

(۳) سامان و مرمت برائے ضروریات طلباء یونیورسٹی .... پچیس ہزار

(۴) بوٹ۔ فیتے۔ اور مرمت .... ایک لاکھ

(۵) بسکٹ۔ ڈبل روٹی۔ کیک وغیرہ .... ایک لاکھ

(۶) مٹھائی اور شکر .... پچھتر ہزار

(۷) دھلوائی پارچہ جات .... ایک لاکھ

(۸) فوٹوگراف اور تصاویر .... پندرہ ہزار

(۹) سامان کرکٹ۔ فٹ بال۔ ہاکی ٹینس وغیرہ .... دس ہزار

(۱۰) میوہ .... تیس ہزار

(۱۱) گھی۔ مکھن۔ دودھ۔ دہی۔ بالائی۔ برائے ضروریات طلباء ڈائننگ ہال .... دو لاکھ

(۱۲) کتب .... پچاس ہزار

میزان کل پونے تیرہ لاکھ

یہ تخمینہ کئی ماہ کی دریافت کے بعد قائم کیا گیا ہے۔ یونیورسٹی کی آبادی تین ہزار کے قریب ہے تاہم

احتیاطاً فرض کرلیا جاوے کہ اخراجات کی میزان ۲۰۔ لاکھ روپیہ سالانہ ہے۔

"صورت موجودہ"

مدنمبر ۱ یعنے بساطی خانہ کیلئے یونیورسٹی میں کوآپریٹیو سٹورس ہے۔ سامان معمولی بساطیوں سے خرید کر فروخت کیا جاتا ہے۔ نرخ عموماً بازار سے گراں ہے۔ بیشتر ضروریات مہیا نہیں کی جاتیں۔ حساب قابلِ اطمینان نہیں۔ سنا گیا کہ آمد کا روپیہ بنک میں نہیں رکھا جاتا۔ معلوم ہوا ہے کہ پچھلے سال فروخت فقط سولہ ہزار کی ہوی ہے۔ نفع نہ ہونے کے ابر ہے۔

پارچہ جات اور بوٹ وغیرہ شہر علی گڈھ یا بیرونجات سے تیار کرائے جاتے ہیں یا انگریزی دکانوں سے منگوائے جاتے ہیں۔ شہر اور بیرونجات میں خرید کیلئے جانے پر طلبا ایک معقول رقم کرایہ کی خرچ کرتے ہیں۔ مال ناقص ہوتا ہے چیزوں کے لئے بار بار تقاضا کرنا پڑتا ہے۔ مثال کے طور پر درج ہے۔ کہ میرے بچوں کے کپڑے دہلی میں بنتے ہیں اور بوٹ میرٹھ۔ آگرہ۔ یا کانپور میں۔

کمرے کا سامان وغیرہ ہر ایک طالب علم گراں قیمت پر بازار سے خریدتا ہے۔ چیزیں پائدار نہیں ہوتیں۔ اور یونیورسٹی سے رخصت ہونے پر اونے پونے بیچ دی جاتی ہیں۔

ایک ڈپو میں کتابوں کی بہم رسانی کا پورا انتظام نہیں۔ سال گزشتہ میں بچوں کو کئی مہینے تک میں نہیں مل سکیں۔ گھی۔ دودھ۔ مکھن میں عموماً آمیزش ہوتی ہے۔

دس بارہ لاکھ روپیہ کا بیشتر حصہ غیروں کی جیب میں جاتا ہے۔

اسوقت ہندوستان کی تجارت غیر قوموں کے ہاتھ میں ہے مسلمان وقتاً فوقتاً جوش میں آکر دکانیں کھولتے ہیں لیکن ناتجربہ کاری، سرمایہ کی کمی، خریداروں کی نادہندگی، مسلمانوں کے عدم تعاون، اور غیروں کے مقابلہ کی وجہہ سے چند روز میں سرمایہ ضایع کر بیٹھتے ہیں۔ اِن وجوہات سے وہ مسلمان جن کے پاس روپیہ ہے کاروبار شروع کرنے کو تیار نہیں۔ چندوں، اور کمپنیوں کے متعلق ملک میں عام طور سے بے اعتباری پھیل رہی ہے۔ پس ان ضروریات کی بہم رسانی کے لئے کمپنی بنانے کا خیال عبث ہے اور اسمیں کامیابی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

"تجویز"

ضروریات مندرجہ بالا کے بہم پہنچانے کیلئے مسلم یونیورسٹی کوآپریٹیو سٹورس یا سوسائٹی قائم کیجاوے۔
یونیورسٹی کا ہر ایک فرد لازماً مجوزہ سٹورس کا ممبر ہو۔ ممبران کورٹ و سابق طلباء حصہ دار ہو سکتے ہیں۔
کسی شخص کو ایک سو سے زیادہ حصص خریدنے کے اجازت نہیں قیمت فی حصہ پانچ روپیہ۔
انتظامیہ کمیٹی میں اساتذہ۔ طلباء۔ اور سابق طلباء ہوں لیکن بیشتر حصہ طلباء کا ہو۔
کاروبار کی نگرانی کیلئے تنخواہ دار منیجر اور حساب کتاب رکھنے کے لئے تنخواہ دار اکونٹنٹ ہو۔ ہر ایک شعبہ کیلئے ایک نائب منیجر تنخواہ دار۔ ان جملہ عہدہ داران کے اسسٹنٹ طلباء ہوں۔
جملہ مال کمیشن پر خریدا جائے، یا تھوک فروش دکانوں اور کارخانوں کی ایجنسی حاصل کی جاوے۔ مال فروخت ہونے پر یا ماہواری فروخت پر حق کمیشن وضع کر کے دکاندار یا کارخانہ دار کی رقم ادا کی جائے۔ حق کمیشن پانچ فیصدی بلکہ اس سے بھی زیادہ ملنے کی امید ہے۔
سٹورس میں فروخت نقد ہوگی۔ خاص صورتوں میں والد یا ولی کی منظوری اور افسر مجاز کی اجازت سے بیس پچیس روپیہ تک اشیاء قرض پر دیجا سکتی ہیں بدیں شرط کہ آیندہ ماہ کے یونیورسٹی بل کے ہمراہ رقم وصول کر لی جائے گی۔

سب سے پہلے بساطی خانہ اور مدات نمبر ۱۹ اور ۱۲ کا کام شروع کیا جاوے۔ اسکے بعد درزی خانہ۔ شوز فیکٹری۔ بکیری یعنے بسکٹ ڈبل روٹی وغیرہ بنانے کا کام۔ لانڈری یعنے پارچہ جات کی دھلوائی کا کام بذریعہ مشین۔ فرنیچر کرسی وغیرہ بنانے کا کارخانہ۔ ڈاری فارم یعنے دودھ مکھن کا کام بتدریج شروع کئے جائیں۔

"منافع اور اسکی تقسیم"

فروخت کے لئے مال زیادہ تر کمیشن پر یا بطور ایجنسی کے حاصل کیا جائے گا اور نقد پر بیچا جائے گا۔ اشتہارات وغیرہ پر خرچ کم ہوگا۔ اور طلباء بطور اسسٹنٹ کے سٹورس کے مختلف حصوں میں کام کریں گے اسلئے کام پورے طور پر جاری ہو جانے سے ایک لاکھ روپیہ سالانہ خالص منافع کی توقع بیجا نہیں اس کو حسب ذیل طریقہ پر تقسیم کیا جائے:۔

(۱) ریزروفنڈ .... پچیس ہزار

اس طریقہ سے سوسائٹی کے پاس معقول سرمایہ جمع ہوتا رہے گا۔

(۲) حصہ داروں کو بونس یا منافع .... چالیس ہزار

(۳) وظائف خصوصاً ان طلباء کو جو سٹورس کے مختلف حصوں میں کام کریں ... - پندرہ ہزار

(۴) لائبریری اور اخبارات .... دس ہزار

یونیورسٹی میں لائبریری ضروریات کے مطابق نہیں ہے اخبارات کافی نہیں ہیں۔

(۵) کرکٹ۔ رائڈنگ سکول۔ جمنیزیم و دیگر کھیلیں .... دس ہزار

چندہ اور آمدنی کی کمی کیوجہہ سے کرکٹ اور رائڈنگ سکول عموماً دست سوال پھیلاتی رہتے ہیں۔
تربیت جسمانی کا انتظام اسوقت بالکل نہیں۔ اس کیلئے سامان اس رقم سے مہیا
ہوسکتے ہیں۔

"دیگر فوائد"

(۱) طلباء کو نفع پر روپیہ لگانے کا شوق پیدا ہوگا۔ اور وہ تجارت کیطرف مائل ہونگے۔ اور ان میں
مل جل کر کام کرنے کا مادہ پیدا ہوگا۔

(۲) ممبروں کو چیزیں عمدہ۔ ارزاں۔ اور یونیورسٹی کی حدود کے اندر میسر ہوسکیں گی۔

(۳) فضول خرچی اور قرض پر چیزیں خریدنے کی عادت کم ہوگی۔

(۴) ہرسال پچاس ساٹھ طلباء کاروباری زندگی کیلئے طیار ہوکر علی گڈھ سے نکلیں گے۔ جن تعلیم یافتہ
نوجوانوں کو ملازمت حاصل کرنے میں مشکلات پیش آتی ہیں، وہ تھوڑے سے سرمایہ سے اپنی
معاش پیدا کرسکیں گے۔ اور مختلف مقامات پر دوکانیں جاری ہونے سے یہ تحریک رفتہ رفتہ
ہندوستان کے مسلمانوں میں پھیل جائیگی۔

(۵) اخراجات مندرجہ بالا کے علاوہ یونیورسٹی میں تعمیر، چھاپہ خانہ، اجناس، گوشت، مرغی، انڈا
سبزی، ترکاری اور بہت سے اور سلسلے ہیں، سٹورس کا میدان عمل رفتہ رفتہ وسیع ہونے پر زراعتی

فارم وغیرہ جاری ہوسکتے ہیں، اور تعمیر کا کام سنبھالا جاسکتا ہے۔
ٹیکنیکل تعلیم کے سلسلے میں علیگڈھ میں عملی کام ہوسکتا ہے گویا مسلم یونیورسٹی صحیح معنوں میں ہندوستان کے مسلمانوں کی "درس گاہ" ہوجائے گی۔
تعلیم کے معنے محض کتابوں کا پڑھا دینا نہیں ہے۔ بلکہ طلباء کو زندگی کی کشمکش کیلئے طیار کرنا ہے۔

---

۰ ر مئی ۱۹۲۶ء

مخدومی و معظمی نواب صاحب قبلہ دام عنایتہ۔ وعلیکم السلام

گرامی نامہ کل شام کو صادر ہوکر باعث مسرت و افتخار ہوا۔
کوآپریٹو سکیم کے متعلق کاغذات میں جناب والا کے دفتر سے لے آیا تھا۔ سید عبدالجلیل صاحب کے نوٹ پر غور کرتا رہا۔ اس اثناء میں مخدومی ڈاکٹر صاحب اس تجویز کے متعلق وقتاً فوقتاً تحریر فرماتے رہے۔ کل صبح ان کا والا نامہ صادر ہوا جس سے معلوم ہوا کہ جناب والا کے مشورہ اور منظوری سے دودھ مکھن اور بساط خانہ کا ٹھیکہ دینے کی تجویز ہوئی ہے اور درزی خانہ اور شوز فیکٹری کی فکر ہو رہی ہے۔ الحمدللہ۔
مخدومی ڈاکٹر صاحب نے یہ بھی تحریر فرمایا ہے، کہ جناب والا میری تجاویز پر حسب صورت حالات عمل فرمانے کو تیار ہیں۔ جزاک اللہ۔
کوآپریٹو سکیم کے متعلق میرا پہلا نوٹ مفصل ہے۔ وہ اور سید عبدالجلیل صاحب کا نوٹ ملاحظہ فرمائیں چند باتیں اور عرض کرنا چاہتا ہوں۔ اس وقت خدا کے فضل و کرم سے ہماری یونیورسٹی میں طلباء کے تعداد میں روز افزوں ترقی ہے اور اسپر کارکنان یونیورسٹی بجا طور سے فخر کرسکتے ہیں۔ لیکن یہ امر بھی غور طلب ہے کہ جب یہ ابنوہ فارغ التحصیل ہوکر علیگڈھ سے رخصت ہونگے۔ تو یونیورسٹی کی تعلیم ان کو روزی کمانے میں کہاں تک مدد دیگی۔
سرکاری ملازمت عموماً نوجوانوں کا نصب العین ہے۔ لیکن اسامیاں محدود ہیں، اور اس سلسلہ میں جو مشکلات ہمارے نوجوانوں کو پیش آرہی ہیں وہ جناب والا سے مخفی نہیں۔

قانون پیشہ اصحاب کی تعداد ہر جگہ اسقدر بڑھ گئی ہے کہ سوائے خاص قابلیت کے نوجوانوں کی اس سلسلہ میں کھپت اور ترقی کی گنجایش نہیں۔ ہمارے طلبا کے داخلہ پنجاب کی رکاوٹ خدا کرے آپ کی سعی سے رفع ہو جائے۔

یہ تو کیفیت ہے ان طلبا کی جو بی۔ اے یا ایم۔ اے یا ایل ایل بی یا اسی قسم کی ڈگریاں حاصل کرتے ہیں لیکن بہت سے طلبا، ان ڈگریوں کو حاصل کرنے سے پہلے علی گڑھ سے چلے جاتے ہیں تعلیم کی وجہ سے ان کو معمولی کام کرنے سے عار ہوتا ہے۔ بیکاری میں جدی جائداد کی آمدنی یا فروخت پر انکی گذر ہوتی ہے عام مسلمان گھرانوں کی یہ حالت ہے کہ روپیہ پیسے کی قدر نہیں۔ کفائت شعاری کو کنجوسی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ کاروباری طریقوں سے قطعی ناواقفیت ہے۔ ایسے گھرانوں کے بچے ان معاملات میں جیسے کورے یونیورسٹی میں داخل ہوتے ہیں ویسے ہی کورے واپس جاتے ہیں بیس تیس روپیہ ماہوار کی سرکاری نوکری کیلئے جوتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ وہ بھی دوسری قوموں کے نوجوانوں کی طرح ہزار دو ہزار کے سرمایہ سے اپنا گذارہ کر سکتے ہیں۔ اگر خیال اسطرف مائل بھی ہو تو کامیابی کی امید نہیں ہوتی۔ کیونکہ دکانداری کے لئے انٹرنس اور ایف اے تو کیا بی۔ اے۔ ایم۔ اے کی ڈگریاں بیکار ہیں۔ بلکہ ایک خاص قسم کی تعلیم اور تربیت کی ضرورت ہے۔ ہندوؤں کے صغیر سن بچے محض اپنی تربیت کی وجہ سے دکانداری کے اصولوں اور طریقوں کو ہمارے تعلیم یافتہ نوجوانوں سے بدرجہا بہتر سمجھتے ہیں۔ تجارت بالعموم غیر قوموں کے ہاتھ ہے اور مسلمانوں کی کمائی غیر قوموں کی جیب میں جاتی ہے نتیجہ یہ ہے۔ کہ ہماری قوم میں افلاس اور بیکاری روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔

ہندوستان کی یونیورسٹی میں عام طور سے یہ نقص ہے کہ وہاں کے تعلیم یافتہ عموماً اپنی روزی کمانے کے ناقابل ہوتے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔ نوٹ چسپاں شدہ۔

مجھے اور یونیورسٹیوں سے سروکار نہیں۔ ہماری یونیورسٹی کا یہ مقصد ہے کہ تعلیم دین کی بنیاد پر دنیاوی تعلیم کی عمارت ہو تعلیم دین کا مضمون تو مجھ گنہگار کی قابلیت اور فہم سے بالاتر ہے۔ دنیاوی تعلیم کے متعلق یہ عرض کروں گا کہ ہماری یونیورسٹی کو جو مسلمانان ہند کا تعلیمی مرکز ہونے کی دعویدار ہے زمانہ کی ضروریات سے غافل نہیں ہونا چاہیئے۔

چاروں طرف سے پکار ہے کہ مسلمان ہند کی اقتصادی حالت بد سے بدتر ہوتی جاتی ہے۔ بچاؤ کی یہی صورت ہے کہ وہ تجارت کیطرف مائل ہوں۔ امریکہ اور جاپان نے جسقدر ترقی کی ہے، وہ محتاج بیان نہیں۔ باینہمہ وہاں تجارتی یونیورسٹیاں اور کالج جاری ہوتے جاتے ہیں۔ ملاحظہ ہو نوٹ چسپانیدہ۔

برادران وطن کا یہاں تجارت میں غلبہ ہے لیکن وہ بھی اسبارے میں غافل نہیں۔ چند دن ہوئے کہ لاہور میں ایک تجارتی مدرسہ کا افتتاح ہوا ہے۔

ہمارے ہاں تجارت تو درکنار صنعت وحرفت کی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں۔ سائنس، ٹیکنیکل، اور میڈیکل کالجوں کی تجویزوں کو عملی صورت میں لانے کیلئے کئی برس اور لاکھوں کی رقمیں درکار ہیں۔ میرے خیالِ ناقص میں تجارتی تعلیم کا شعبہ ہماری یونیورسٹی میں فوراً قائم ہونا چاہیئے۔ اور اس علم کے ساتھ عمل کو ملانے کیلئے کوآپریٹو سٹورس سے بہتر ترکیب میری سمجھ میں نہیں آئی۔ اسی خیال سے میں نے اسکی تحریک کی۔ اور میری نہایت ادب سے گذارش ہے کہ سٹور کی سکیم پر غور کرتے وقت اس امر کا ضرور لحاظ فرمایا جاوے۔

دکان کی کامیابی کیلئے چار چیزیں لازم ہیں۔ اول سرمایہ۔ دوم مال ارزاں نرخ پر خریدا جائے تیسرے یہ کہ وہ مال فروخت اور جلد فروخت ہوجائے۔ اور چوتھے یہ کہ وہ بالکل کاروباری طریقہ پر چلائی جائے میں نے اسبارہ میں مسٹر سٹر کلنیڈ آئی سی۔ ایس رجسٹرار کوآپریٹیو سوسائٹیز پنجاب اور خان عبدالمجید خاں صاحب رجسٹرار کوآپریٹیو سوسائٹیز ریاست کشمیر سے گفتگو کی ہے، اور وہ میرے ہم خیال ہیں۔ اب یہ دیکھنا چاہیئے۔ کہ یہ چاروں لوازمات یونیورسٹی میں مہیا ہو سکتے ہیں یا نہیں؟

اول سرمایہ۔ اگر یونیورسٹی کے ہر ایک فرد پر کوآپریٹو سٹوروں کی ممبری لازم کردی جائے۔ اولڈ بوائز کو شمولیت کا حق دیدیا جائے اور ممبری کی فیس یا حصہ کی قیمت پانچ روپیہ مقرر کیجائے تو چالیس پچاس ہزار کی رقم فوراً فراہم ہوسکتی ہے۔ بہت سے ایسے اشخاص ہیں جو بخوشی مخصوص حصص خریدینگے۔

دوم خرید۔ اس سرمایہ سے یا تھوک فروش دکانوں اور کارخانوں سے کمیشن پر ایک مہینہ

وعدہ ادائگی پر حاصل ہوسکتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ سال بھر کی ضروریات ایکدم خریدی جائیں۔ بلکہ تھوڑا تھوڑا مال منگوایا جائے۔ جب وہ فروخت ہوجائے تو اور منگوالیا جاوے۔ اس طریقہ سے مال کے خریدنے کیلئے زیادہ سرمایہ کی ضرورت نہوگی ایسا مال ہرگز نہ منگوایا جائے جسکی مانگ نہو۔ اور دکان پر پڑا سڑا کرے۔

سوم فروخت ۔ یونیورسٹی اور طلباء کی ضروریات معمولی دریافت سے معلوم ہوسکتی ہیں کوآپرٹیو سٹورس کی کمیٹی انتظامیہ کے ممبروں سے منیجر کو ہمیشہ معلوم ہوتا رہے گا۔ کہ کس قسم کے مال کی مانگ ہے۔ ایسی چیزیں بہت جلد فروخت ہوجایا کریں گی۔ مال چونکہ ارزاں خریدا جائیگا، اسواسطے بازار کے بھاؤ سے بہرحال ارزاں ہوگا۔ شہر میں آمدورفت اور پارسلوں کے خرچ سے طلبا بچ جائیں گے۔ ظاہر ہے کہ جبکہ یونیورسٹی کا ہر ایک فرد کوآپرٹیو سٹورس کا ممبر اور نفع کا حصہ دار ہوگا، اور اس کو اپنی ضرورت کی چیزیں ارزاں، عمدہ اور آسانی سے مل سکیں گی، تو وہ سٹورس کو بازار پر ترجیح دیگا۔ علاوہ ازیں خریداروں کو بونس دینے کی تجویز پر عمل کیا جاوے تو دکان کو یقیناً کامیابی ہوگی۔ مثال کے طور پر آرمی اینڈ نیوی کوآپرٹیو سٹورس کمپنی کا ذکر کرتا ہوں۔ جسکے ممبر ہندوستان کے ہر حصہ میں موجود ہیں، اور مقامی دکانوں پر کوآپرٹیو سٹورس کو ترجیح دیتے ہیں۔ جہلم کے سٹیشن کلب میں ایک کوآپرٹیو سٹورس ہے۔ ممبروں کی تعداد سردیوں میں عموماً ۵۵ اور گرمیوں میں ۳۰ ہوتی ہے لیکن سٹورس میں قریباً ساٹھ ہزار سالانہ کی بکری ہوتی ہے۔ درآنحالیکہ شہر اور چھاؤنی میں اور دکانیں موجود ہیں۔ اور ممبر عموماً لاہور اور راولپنڈی جاتے رہتے ہیں۔

میں یہانتک عرض کرونگا کہ اگر مجوزہ مسلم یونیورسٹی کوآپرٹیو سوسائٹی کی کامیابی میں کوئی کاوٹ نظر آئے، تو بورڈرس کو حکماً باہر سے چیزیں خریدنے سے روک دیا جائے۔ اگر کارکنان یونیورسٹی کو اختیار ہے، کہ وہ ہندوستان کے مختلف حصوں کے طلبا، کو ایک قسم کا لباس پہننے اور کھانا کھانے پر مجبور کریں اور بہت سی باتیں ان کیلئے لازم قرار دیدیں، تو کوئی وجہ نہیں، کہ ایسا حکم جاری نہ کیا جائے جس سے طلبا، اور ان کے والدین، ساتذہ اور یونیورسٹی کا فائدہ ہی فائدہ ہے۔ اس کا مفصل تذکرہ میں اپنے عریضہ مورخہ ۲۷۔ اپریل بنام مخدومی ڈاکٹر صاحب میں کرچکا ہوں۔

چہارم ۔ منیجر وغیرہ آنریری ہرگز نہوں۔ موجودہ اسٹاف کے ممبر، آنریری اصحاب پورا وقت دکان کے

کاموں میں صرف نہیں کرسکتے۔ اسٹاف کے ممبر یونیورسٹی سے اسلئے تنخواہ پاتے ہیں، کہ وہ اپنا وقت اور دماغ تعلیمی معاملات میں صرف کریں۔ ان میں سے اگر کسی صاحب کو سٹورس میں لگادیا گیا، تو اول تو وہ غالباً اس کام کے اہل نہونگے۔ دوم ان کے فرض منصبی میں ہرج ہوگا، یا سٹورس کا کام بگڑے گا، اور سوم بے ضابطگی کی صورت میں ان سے بازپرس ہونے میں مشکل ہوگی۔ کیونکہ ڈسپلن اور پوزیشن کا سوال پیدا ہوجائے گا۔

منیجر اکونٹینٹ۔ اسسٹنٹ منیجر وغیرہ ایسے آدمی ہونے چاہئیں۔ جو اپنے اپنے صیغہ میں ماہر ہوں اور اس شعبہ کا کام پوری طرح انجام دے سکیں۔ ان سے معقول ضمانت لیجاے اور معقول تنخواہ دی جائے۔ انکے کام پر نگرانی کرنے کیلئے ایک کمیٹی انتظامیہ بنائی جاے۔ جس کے اجلاس کم سے کم ۳۰ دن کے وقفہ کے بعد ہوا کریں۔ ان اجلاسوں میں خرید و فروخت کو جانچا جائے، مال موجودہ دکان کی پڑتال سٹاک بک وغیرہ سے نئی چیزیں خریدنے کا فیصلہ کیا جاوے اور خاص طور سے دیکھا جاوے۔ کہ دکان میں کسی قسم کی بے ضابطگی یا خیانت تو نہیں ہوئی؟ ممبران کمیٹی کو ہر اجلاس میں شمولیت کا معاوضہ دیا جاوے۔

ممکن ہے علی گڈھ میں حسب مطلب آدمی نہ مل سکیں۔ لیکن ہندوستان میں بہتر سے بہتر آدمی مل سکتے ہیں۔ دکان کے ہر حصہ میں جدید طلبا کو بطور اسسٹنٹ کام کرنے کی اجازت ہوگی لیکن وہ تنخواہ دار اسسٹنٹ کی نگرانی میں کام کریں گے، جو انکے افعال کا ذمہ دار ہوگا۔ اور روپیہ پیسہ یا مال ہرگز ہرگز انکی تحویل میں نہ ہوگا۔ ایسے طلبا، کو وظائف بھی دیئے جا سکتے ہیں۔

قرض پر مال ہرگز فروخت نہ کیا جائیگا۔ اکثر دکانیں نادہند خریداران کی وجہ سے بیٹھ جاتی ہے۔ نقد فروخت کی پابندی سے طلبا میں قرض پر مال لینے کی عادتیں کم ہوجائیں گی، اور فضول خرچی کی بھی رکاوٹ ہوجائیگی۔

اکیس برس گذرے، خان عبدالمجید خاں صاحب نے مسٹر ولبرفورس کی نگرانی میں ضلع جالندھر میں کوآپریٹیو سوسائٹی کا کام شروع کیا۔ ساہوکاران اور دیگر اہل غرض نے انکے کام میں ہر طرح روڑے اٹکائے لیکن عزم و استقلال کو آخر کامیابی ہوئی، اور یہ تحریک سارے پنجاب میں پھیل گئی۔ صورت موجودہ یہ ہے۔ کہ اس صوبہ میں پندرہ ہزار سوسائٹیاں ہیں۔ جن کے ۴ ½ لاکھ ممبر ہیں اور سرمایہ نوکرور ہے۔

پنجاب کے ڈنگے اگر اکیس برس میں یہ کچھ کرسکتے ہیں، تو کیا ہماری یونیورسٹی جس میں ہندوستان کے

بہترین دل و دماغ موجود ہیں، کوآپریٹو سکیم کو کامیاب نہیں بنا سکتے؟ ممکن ہے کہ موجودہ کوآپریٹو سوسائٹی کی ناکامیابی کے باعث کارکنان یونیورسٹی کو مجوزہ سٹورس کے جاری کرنے میں تامل ہو۔ اہل ہمت کیلئے ناکامیابی کی حقیقت کامیابی کا زینہ ہے۔ اسواسطے کارکنان یونیورسٹی کو اس ناکامی سے دل برداشتہ نہیں ہونا چاہئے۔ جو نقائص موجودہ سوسائٹی کی ناکامی کا باعث ہوئے ہیں، ان کو دور کر دیا جائے تو کوئی وجہہ نہیں، کہ تجویز کامیاب نہو۔

ان نقائص کا حال جناب والا اور مخدومی ڈاکٹر صاحب کو مجھ سے بہتر معلوم ہے۔ علیگڈھ میں جن اصحاب سے اس تجویز کا ذکر ہوا ہے، وہ اسکے مفید ہونے کو تسلیم کرتے ہیں لیکن نئی بات سمجھ کر ہچکچاتے ہیں، اور اس کا اجرا ان کو بہت مشکل معلوم ہوتا ہے۔ میں نے انکے خدمت میں عرض کیا ہے، کہ سر سید علیہ الرحمتہ کی بنائے مدرسۃ العلوم سے زیادہ انوکھی بات نہیں، اور دیگر مقامات میں اس قسم کے سٹورس کامیابی سے چل رہے ہیں۔ ضرورت فقط اس بات کی ہے۔ کہ یہ کام ایسے اصحاب کے سپرد کیا جاوے جو اسکے اہل ہوں۔ تجارت کے اصولوں سے واقف ہوں، اور عملی طور سے کام کر چکے ہوں۔

اس کام کے جاری ہونے سے یونیورسٹی میں ایک عمدہ شعبہ بغیر کسی مزید خرچ کے جاری ہو جائیگا۔ ہر سال پچاس ساٹھ لڑکے روزی کمانے کا کوئی نہ کوئی ہنر سیکھ کر نکلیں گے اور رفتہ رفتہ عام مسلمانوں میں یہ تحریک پھیل جائے گی۔

عمارت کا مسئلہ مشکل نہیں۔ دسمبر گذشتہ میں ایک نقشہ طیار کر کے میں نے علیگڈھ بھیجا تھا۔ وہ مخدومی خان بہادر حبیب اللہ خاں صاحب یا مکرمی حاجی محمد صالح خاں صاحب کے پاس ہوگا۔ اسکے ملاحظہ سے جناب والا کو معلوم ہو جائے گا کہ عمارت ایسی محفوظ ہوگی کہ کوئی شخص بجز اکونٹینٹ اور خزانچی کے انکھ بچا کر وہاں سے نہیں نکل سکتا۔ یہ عمارت بیس ہزار روپیہ میں تیار ہو سکتی ہے، اور کام شروع ہونے کے تین چار برس کے اندر بلکہ اس سے بھی کم عرصہ میں اسکی قیمت ادا ہو سکتی ہے۔

یونیورسٹی اور طلبا کی سالانہ ضروریات کا اندازہ میں نے کئی ماہ کی دریافت کے بعد قائم کیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ طلباء کے اخراجات کا صحیح اندازہ والدین کو ہو سکتا ہے۔ جن کو فیس ادا کرنی پڑتی ہیں، مگر اصحاب سٹاف کو لیکن میں بحث کی خاطر مان لیتا ہوں کہ سید عبد الجلیل صاحب کا اندازہ درست ہے اگر طلباء کا

سالانہ خرچ تین لاکھ ہے۔ تو سٹورس کو پچیس تیس ہزار روپیہ سالانہ خالص منافعہ ہوسکتا ہے، اور یہ رقم ایسی حقیر نہیں، کہ اسکو آسانی سے نظرانداز کیا جا سکے۔ اسکے علاوہ جو فائدے ہیں۔ ان کا ذکر میرے پہلے نوٹ میں موجود ہے۔

سید صاحب موصوف کی جائنٹ سٹاک کمپنی کی تجویز کی بابت میں کچھ عرض نہیں کرسکتا، کیونکہ مجھے معلوم نہیں، کہ ایسی کمپنی کے قائم کرنے کیلئے کون کون اصحاب طیار ہیں اور کسقدر سرمایہ بہم پہنچا سکتے ہیں، اور یونیورسٹی کو اس میں کس قدر دخل ہوگا۔

وظائف کے متعلق جو تجویز موصوف نے فرمائی ہے اس سے مجھے اتفاق ہے۔

اب جناب والا، مخدومی ڈاکٹر صاحب اور اصحاب اگزیکٹیو کونسل کے قابل غور یہ امر ہے، کہ آیا کوآپرٹیو سٹورس یونیورسٹی کیلئے زیادہ فائدہ مند ہے یا وہ سلسلہ جس کا ذکر مخدومی ڈاکٹر صاحب نے اپنے گرامی نامہ مورخہ ۱۳ ماہ حال میں فرمایا ہے۔

دودھ مکھن کی تجویز تو بہت اچھی ہے لیکن باقی چیزوں کے تعلق میں مزید غور کی درخواست کرتا ہوں، اور جناب والا کی صحت سلامتی کی دعا پر اس طویل عریضہ کو ختم کرتا ہوں۔ زیادہ حد ادب

نیازمند

برادر مکرم تسلیم۔ مرسلہ پوسٹ کارڈ پہونچا شکریہ۔ علیگڈھ اولڈبوائے کے حیدرآباد سے نکلنے کی خبر سے بید مسرت ہوئی! ور زیادہ تر اس سے خوشی ہوئی کہ ہمارے حیدرآباد کے اولڈبوائے نے اس احساس میں پیشقدمی کر کے ہمت سے اور مستقل مزاجی سے اس کام کو اپنے ہاتھ میں لیا۔ خداوند تعالیٰ انکے ارادوں میں برکت عطا فرمائے۔ ہم سب اور ہر ایک علیگڈھ اولڈبوائے کا فرض ہے کہ اس کام میں انکا ہاتھ بٹائے اور اپنی حتی الوسع ہر ممکنہ کوشش سے جائز طور پر دریغ نکرے۔

پرچہ آنے پر انشاءاللہ تعالیٰ میں ضرور کوشش کرکے جسقدر علیگڈھ اولڈبوائے یہاں اور دیگر اضلاع پر موجود ہیں انکے نام پرچہ جاری کراؤنگا۔

اور آپکے حسب تحریر انشاءاللہ تعالیٰ۔ آپکے رسالہ کے آخری ورق کے سوالات کا جواب بھی ادا کرونگا۔

سید افتخار حسین۔ از رائچور

یونان کے جزیرے

(۱)

یونان کے جزیرے یونان کے جزیرے — سافو کی عشقبازی بلبل کا ہے چہکنا
وہ بزم کے سلیقے وہ رزم کے وتیرے — ڈیلاس کا ابھرنا فیبس کا وہ چمکنا
اب بھی بسنت رُت میں جنت بنا ہے سب کچھ — سورج کے اک علاوہ ڈوبا ہوا ہے سب کچھ

(۲)

سی اِئی وہ اور ٹی اِئی شعر و سخن کی دیوی — وہ بین سورمائی وہ بانسری پریمی
اپنے ہی ساحلوں پر شہرت نہیں ہے جن کی — جنکے جنم کی بھومی اُن کیلئے ہے گونگی
وہ راگ گونجتے ہیں پورب میں دور چل کر — ان پاک ٹاپوؤں سے اسلاف کے نکل کر

(۳)

مرتھان اور پربت مہ کا دیکھا ہے نقشہ — مرتھان کے کنارے لہرا رہا ہے دریا
کھویا ہوا سا تنہائیوں میں نے خواب دیکھا — آزاد پھر یہ اکدن یونان دیس ہوگا
پیوند خاک جس جا ایران کی ہو سینا — خود کو غلام سمجھوں ممکن بھلا یہ کب تھا

(۴)

ساحل کی وہ پہاڑی وہ شہریار بیٹھا — سلمیس بھی سامنے ہے بخت دلِ سمندہ
نیچے جہاز صدہا اقوام کی وہ سینا — بیڑے یہ سب اُسی کے اس کا ہی لاؤ لشکر
گنوا لیا تھا اُسنے اک اک کو دن نکلتے — سورج کے ڈوبنے تک وہ ٹھاٹ سب کہاں تھے؟

(۵)

ہاں ٹھاٹ وہ کہاں ہے؟ تو بھی بتا کہاں ہے — میرے وطن یہ ساحل تیرے جو بے صدا ہیں
وہ گیت سورمائی گویا کہ بے زباں ہے — تیرے نہ دیوتا ہیں اب وہ نہ سورما ہیں
کیا اب یہ دیوتائی یکتا ستار تیرا — ان بے کمال ہاتھوں دنیا میں خوار ہوگا؟

(۶)

شہرت کا کال ایسا اتنا ہی ہے غنیمت — مانا کہ قوم میری پہنے ہوئے ہے بیڑی
اِک عاشقِ وطن کو آئے ذرا سی غیرت — شاعر کے واسطے یاں اب کیا رہا ہے باقی
اے دیس چاہتا ہے اس سے زیادہ کیا تو — یونانیوں پہ لجا یونان پر دو آنسو

(۷)

روتے رہیں گے کب تک ماضی کی داستاں پہ — ہم شرم سے گڑے ہیں آبا تھے رن میں تے
وہ سورما وطن کی بس نام ہیں یاں پر — پر تھی نکال تیرے اسپارٹا کے مردے
ان تین سو کے بدلے ہو جائیں تین زندہ — پھر دیکھے زمانہ تھرماپلی کا نقشہ

(۸)

بولی نہیں خموشی کیسی یہ چپ لگی ہے — سنا وہ رفتگاں کی آواز آرہی ہے
اک مردے گر جیتی ندی چڑھی ہوئی ہے — زندہ دماغ تم میں بتلاؤ اب کوئی ہے
ہو جائے ایک زندہ سمجھو کہ ہم یہاں ہیں — رونا یہی ہے سارا زندہ ہی بے زباں ہیں

(۹)

سنتا ہے کون اپنی اب چیز اور چھیڑیں — پھر دیکھئے لبالب جام شراب سامی
ترکوں کو ہی مبارک جنگ جدل کی سیریں — ہو خون تاک سے اوہام اور عیش کامی
سنکر صدائے عشرت کس شوق سے ہیں اُٹھے — کیسے ہیں ٹوٹے مرتے بے کس کے مست بندے

(۱۰)

رائج ہو ناچ پیرہک اس کا ہو اب بھی چرچا — پیرہک پرہو کہاں ہیں انکا بھی کچھ پتا ہے
اک بزم کا سبق تھا اک رزم کا سبق تھا — مردانہ تر سبق کو تمنے بھلا رکھا ہے
بنیاد علم و فن کی کڈمس کی وہ الف بے — تم سے غلام ہرگز اُسکے نہ اہل ہوتے

(۱۱)

پھر دیجئے لبالب جام شراب سامی — ہمنے بھلا دئے ہیں مضمون وہ بھی آخر!
گانے اناکرینی جن سے ہوئے ہیں نامی — سچ ہے پلی کراٹس آقا تھا ایک جابر
مانا کہ تھی غلامی اس دھیان میں مگن تھے — اسوقت اپنے آقا اپنے ہی ہموطن تھے

(۱۲)

جابر وہ کرسنیس کا وہ حریت کا حامی — وہ بے جگر بہادر وہ حریت کا شیدا
وہ کون ہے ملٹیاڈس تاریخ میں گرامی — ہوجائے کچھ دنوں کو پھر مستبد جو ایسا
شیرازہ ہو اکٹھا مٹ جائے پھوٹ ساری — بکھرے ہوؤں کو باندھے زنجیر اتحادی

(۱۳)

بھر دیجئے لبالب جام شراب سامی — سیولی کے پربتوں پر پرگا کے بھی کنارے
اب بھی بچی کھچی کچھ ہے ایک نسل باقی — ڈورک نژاد مائیں جنتی تھیں جیسے جائے
اک آدھ وہاں عجب کیا پا جائے بیج کوئی — جسکی رگوں میں دوڑے خوں ہراکلیڈی

(۱۴)

گر نا نہ تم بھروسہ ہرگز فرنگیوں پر — فرمانروائے مغرب قوموں کو بیچتا ہے
تلوار پر ہی دیسی دیسی سپاہیوں پر — اقوام کو بھروسہ ہر حال میں رہا ہے
لاطینیوں کے فتنے عثمانی عساکر — یونان توڑ دینگے تیری سپر کو آخر

(۱۵)

بھر دیجیے لبالب جام شراب سامی　　سائے میں ناچتی ہیں وہ تیریاں وطن کی
آنکھیں وہ کالی کالی موٹی کٹی رسیلی　　کلیاں ہیں کھلنے والی جوبن یہ اس چمن کی
اس دھیان سے ہی آنسو جلتے ہوئے بھر آئے　　آخر غلام ہونگے ان گودیوں کے جائے

(۱۶)

میں اور سوز نیم کی مرمر کی وہ ڈہلائیں　　موجوں کے ساتھ میری بچپن روح تڑپے
لہروں کی اور میری اپنی ملی کی تانیں　　شل سوان گاتے گاتے ہی جان نکلے
میرا وطن نہیں ہو جس ملک میں غلامی　　دے مارے زمین پر جام شراب سامی

مسلم یونیورسٹی کی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ

ڈاکٹر ضیاء الدین اور عملہ ماتحت کو علیحدگی کا نوٹس

دہلی ۲۴ مارچ۔ جریدہ بمبئی کرانیکل کے نامہ نگار خصوصی کو معتبر ذریعہ سے معلوم ہوا ہے کہ مسلم یونیورسٹی علیگڈھ کی تحقیقاتی کمیٹی نے اپنی رپورٹ پیش کر دی ہے اور ارباب یونیورسٹی نے اسے بورڈ کے ارکان کے پاس بھیجدیا ہے یہ رپورٹ فی الحال صیغہ راز میں رکھی گئی ہے تاہم معلوم ہوا ہے کہ اس میں یونیورسٹی کے متعلق متعدد نقائص بتلائے گئے ہیں اور شہادتوں سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ یونیورسٹی کے ضوابط اور قوانین وغیرہ سے علانیہ انحراف کیا جا رہا ہے۔ اس رپورٹ میں نہایت ہی اہم تبدیلیوں کی سفارش بھی کیگئی ہے۔ علی الخصوص قابل ذکر یہ ہے کہ یونیورسٹی کے سارے عملے کو علحدہ کر کے جدید عملہ بھرتی کرنیکا مطالبہ کیا گیا ہے تاکہ یونیورسٹی کی زندگی میں نئی روح پھونکی جاسکے۔ معلوم ہوا ہے کہ ڈاکٹر ضیاء الدین پرو وایس چانسلر سے کہا گیا ہے کہ وہ ریٹایر ہونے سے پیشتر رخصت لے لیں۔ یونیورسٹی کے معاملات کی اصلاح کے پیش نظر تین سال کیلئے خاص افسر کے تقرر کی سفارش بھی کیگئی ہے۔

علیگڈھ ۲۶ مارچ مسلم یونیورسٹی کے ذمہ دار حلقوں سے اس افواہ کی تصدیق ہو رہی ہے کہ ڈاکٹر ضیاء الدین اپنے عہدے سے مستعفی ہو گئے ہیں اسکے متعلق کوئی سرکاری اعلان نہیں ہو سکا چند پروفیسروں کو بھی نوٹس دیا گیا ہے کہ وہ اپنے استعفے داخل کر دیں۔ یونیورسٹی کے امتحانات ۱۰ اپریل سے شروع ہونگے اور اسکے بعد یونیورسٹی موسم گرما کی طویل تعطیلات کیلئے بند ہو جائیگی۔ رپورٹ میں جس تغیر و تبدل کی تجویز پیش کیگئی ہے اسکی یونیورسٹی کے دوبارہ کھلنے کے بعد عملدرآمد ہوگا۔ یونیورسٹی کورٹ کا اجلاس ۱۱ مارچ کو منعقد ہوا۔ ڈاکٹر محمود نے یونیورسٹی کے خلاف مقدمہ دائر کیا تھا کہ اسکے ارکان نے اس رپورٹ کو عوام میں مشتہر کیوں نہیں کیا۔ یہ مقدمہ غیر معین وقت تک ملتوی کر دیا گیا ہے۔

شرح دیوان غالب پر ایک نظر

(۲۸)

ترے وعدہ پر جئے ہم تو یہ جاں جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

شرح ہے۔ ہمنے جو یہ کہا کہ فقط وعدۂ وصل سُن کے ہم مرنے سے بچ گئے تو ہمنے جھوٹا جانا" یہ سمنے تو کیسطرح اس شعر سے نہیں نکلتے معلوم نہیں شارح کا خیال اس جانب کیوں منتقل ہوا۔ ہاں اسکے بعد دوسرے احتمالی معنے جو بتائے ہیں وہ بالکل صحیح ہیں کہ "تیرا وعدہ سُنکر جو ہم جئے تو اسکا سبب یہ تھا کہ اسے جھوٹا وعدہ خیال کیا۔ اسپر اتنا اور بڑہانے کی ضرورت ہے کہ" اگر تیرے وعدہ کو سچا سمجھتے تو شادی مرگ ہو جاتے"۔

(۲۹)

ہوس کو ہے نشاط کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

اس کے دو مطلب بیان کئے گئے ہیں۔ "(۱) رقیب بلہوس کی ہوس کو نشاط کار و لطف وصل نگار حاصل ہے۔ اب ہمارے جینے کا کیا مزہ؟" اگرچہ شارح علامہ لکھتے ہیں کہ مصنف کی اصطلاح میں ہوس محبت رقیب کا نام ہے اور سند میں اسی غزل کا یہ مصرع پیش کرتے ہیں ع ہوس کو پاس ناموس وفا کیا۔ پھر جو مطلب بتایا گیا ہے وہ مجھ کو الفاظ شعر میں کہیں سے نظر نہیں آتا۔ میرے نزدیک یہ نظیر کا مصرعہ اس دعوے کو ثابت نہیں کرتا کہ مصنف نے ہوس کو محبت رقیب کے معنوں میں باندھا ہے۔ ہوس تو علی العموم عشق صادق کی ضد ہے۔ چاہے ہوس پرست کسی کا

رقیب ہو یا نہ ہو۔ اور پھر اُن معنوں کے ساتھ جو شارح نے مصرعہ اولی کے معنی بیان فرمائے ہیں بلحاظ ترتیب الفاظ و ترکیب بیان کوئی لگاؤ نہیں لیکن اگر لغت یا دلالت مجازیہ بھی معنے لینے پر مجبور کر رہی ہے تو میں اس شعر کا حل یوں کرونگا "ہوس = محبت کا جنون، محبت ناقص (اسلئے) = محبت رقیب۔ نشاط کار = حاصل اس کا زیست جو عیش و نشاط میں گزرے اور ممتد بھی ہو۔ اب پہلے مصرع کے معنے یوں کیجیے کہ۔ رقیب جو بجنونانہ اظہار محبت کرتا ہے نشاط کار کا بھی طالب ہے، یعنے اس کا ادعائے محبت مشروط ہے بقائے حیات اور حصول عیش و نشاط پر۔ برخلاف عاشق کے جس کے محبت مشروط بہ خود غرضی نہیں بلکہ وہ معشوق کی ایک ادائے ناز پر جان فدا کر دینے کو حیات جاودانی سمجھتا ہے۔ پس شاعر کہتا ہے کہ رقیب بوالہوس کو دیکھو محبت کا دعوی بھی کرتا ہے اور جان کو بھی عزیز رکھتا ہے حالانکہ جان جو اسقدر عزیز ہے وہ محض اسوجہہ سے ہے کہ موت کا کھٹکا لگا ہوا ہے اگر معلوم ہو جائے کہ موت نہ آئیگی تو پھر زندگی کی کوئی قدر باقی نہ رہے۔ حاصل یہ کہ مزہ جینے کا عشق کے ساتھ ہے جو مترادف ہے موت کا نہ کہ ہوس کے ساتھ جس کی مراد پر نشاط زندگی ہے" دوسرا مطلب جو بیان ہوا ہے وہ بھی الفاظ شعر سے مغایر نہیں تو تشنہ ضرور ہے۔ فرماتے ہیں: "دنیا میں انسان کو ہوا و ہوس سے رہائی نہیں۔ اگر مرنا نہ ہوتا تو اسطرح کے جینے میں کچھ مزہ نہ تھا یعنے حاصل زندگی مرنا ہے"۔ یہاں بھی جبتک مرنے سے فنافی العشق ہونا مراد نہ لیا جائے شعر دنداں تو جملہ در دہانند کا مصداق قرار پاتا ہے۔ پس اگر یہی معنے لینا ہے تو اسطرح فرمائیے۔ ہوس کو کاروبار زندگی سے نشاط حاصل ہوتا ہے لیکن حقیقی نشاط مرتے (فنافی العشق) میں ہے۔ اسی مطلب کو استاد ذوق نے کیا خوب کہا ہے ؎

مزے جو عشق کے عاشق بیاں کبھو کرتے مسیح و خضر بھی مرنے کی آرزو کرتے

(۳۰)

نفس موج محیط بیخودی ہے
تغافل ہائے ساقی کا گلہ کیا

شرح ہے: "یہاں بے شراب پیئے بیخودی ہے پھر بے التفاتی ساقی کا گلہ کرنا کیا ضرور ہے، جیسے اسکی صورت دیکھ کر بیخودی ہو جائے۔ اُسے وہ شراب نہ دے تو کیا شکایت"۔ اس شرح میں جو توجیہ بیخودی

کی نسرائی ہے وہ ایک مضمون زاید ہے۔ ساقی کی صورت دیکھ کر بیخود ہوجانے کے معنے شعر میں کہیں سے نہیں نکلتے۔ بہتر تھا کہ پہلے ہی جملہ پر شرح کو ختم کردیا جاتا اور اسباب بیخودی کو دریافت کرنے والے دریافت کرتے رہتے" اگرچہ اس صورت میں پہلے مصرعہ کا ربط دوسرے مصرعہ کیساتھ تباناذرا دشوار ہے۔ ہے یہ کہ یہ شعر تشنہ معنی ہے۔ مصرعہ اولیٰ میں یہ دعوےٰ کیا گیا ہے کہ میری ہر سانس بجائے خود ایک موج ہے دریائے بیخودی کی جس سے اغلباً مراد غالب یہ ہے کہ میں روز ازل سے مست صہبائے محبت ہوں۔ پھر شاعر اپنے نفس سے خطاب کرکے کہتا ہے کہ جب ساقی ازل نے تیری نظرت میں مستی و بیخودی ودیعت کردی ہے تو اسکے تغافل کا کیا (کیوں) گلہ کرتا ہے۔ مصرعہ ثانی میں ایک "پھر" کا لفظ ہوتے سے شعر میں ضعف تالیف پیدا ہوگیا ہے۔ کہئیے کہ "میری قسمت ہی میں شراب نہیں ہے ساقی کا کیا گلہ"! "تجھے تو ساقی پہلے ہی پلا چکا پھر اب تغافل کا کیا گلہ ہے"۔ ان مثالوں پر غور فرمائیے اور سمجھئے!

(۳۱)

سُن اے غارتگر جنس وفا سُن
شکست قیمت دل کی صدا کیا

شرح ۔ تو جو یہ کہتا ہے کہ کہیں شکست دل کی خبر نہیں تو کہیں شکست دل میں آواز ہوتی ہے۔ مصنف نے شکست دل کو شکست قیمت دل سے تعبیر کیا ہے"۔ میں عرض کروں گا کہ کیا شکست شے اور شکست قیمت شے کے ایک ہی معنے ہیں؟ جبکہ شکستِ قیمت شے سے کسی شے کی قدر و قیمت کا گھٹ جانا یعنے اسکا بیقدر ہوجانا مراد ہے۔ پھر اس شعر میں شکست قیمت دل سے دلکی قدر و قیمت کا گھٹ جانا یا اسکی تذلیل و توہین کیوں نہ مراد لیجائے؟ لیکن اس سوال سے ایک سوال اور پیدا ہوتا ہے کہ اگر شکست قیمت دل سے مراد دل کی بیقدری لیجائے تو شعر کے معنے کیا ہونگے؟ اسکو سمجھنے والے سمجھیں میں تو اتنا ہی سمجھا ہوں کہ مصرعہ کی تکمیل کیلئے یا جنس کی رعایت سے قیمت کا لفظ بے سوچے سمجھے رکھدیا گیا ہے اور بس!

(۳۲)

تھی خبر گرم کہ غالب کے اُڑینگے پُرزے   دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا

شعر صاف ہے۔ شرح صاف ہے اور جو نسخہ میرے پاس ہے اس میں بھی "یہ تماشا نہ ہوا" چھپا ہے۔
لیکن میں نہیں سمجھتا کہ اگر سستی بندش اور ضعف معنی کو غالب نے جایز رکھا ہو غالباً شاعر نے "یہ" نہیں بلکہ "یہ" کہا ہوگا اسلئے کہ "یہ" کہنے سے تماشا عمومیت کے معنے دیتا ہے اور "یہ" کہنے سے معنوں میں خصوصیت پیدا ہوتی ہے اور یہ محل تخصیص ہی کا ہے یعنے یہ تماشا کہ غالب کے پرزے اڑائے جائیں نہیں ہوا۔

(یہ نوٹ لکھنے کے بعد جب نسخہ حمیدیہ دیکھنے کا اتفاق ہوا تو دیکھا گیا کہ اس میں "یہ" چھپا ہے اور صحیح چھپا ہے)

(۳۳)

وہاں ہر بت پیغارہ جو زنجیر رسوائی
عدم تک بیوفا چرچا ہے تیری بیوفائی کا

شرح:- "کہتا ہے کہ جو حسین کہ طعن وطنز ڈھونڈھا کرتے ہیں ان سب کے دہن تیرے لئے زنجیر رسوائی ہیں۔ یعنے ہر ایک دہن طنز گفتار (پیغارہ جو) ایک ایک حلقہ ہے زنجیر رسوائی کا۔۔۔ حسینوں کے دہن کو عدم کہتے ہیں (شعرا) تو جب انکے دہن میں تیری بیوفائی کا ذکر ہے تو گویا عدم تک پہونچ گیا اور تیری نیکنامی کے پانو میں زنجیر رسوائی پڑگئی"۔ شعر کا حل تو ہوگیا لیکن میں اتنا عرض کروں گا کہ جب نیکنامی کے پاؤں میں زنجیر پڑگئی تو وہ مقید ہوگی پھر بہ حالت پا بہ جولانی ہستی سے عدم تک راہ رسوائی کسطرح طے کی؟ شارح علامہ نے بیوفائی کی جگہہ نیکنامی کہکر حق وکالت ادا کیا ہے۔ لیکن حق یہ ہے کہ یہ شعر نرا لفظوں کا گورکھ دھندا ہے۔ ہاں اگر نیکنامی یا بیوفائی یا رسوائی کے پانوں کی زنجیر کاٹ ڈالی جائے جو حسینوں کے حلقہ ہائے دہن سے بنائی گئی ہے اور بجائے اسکے پہلا مصرعہ یوں کردیا جائے ع۔ وہاں ہر بت پیغارہ جو تھا صور رسوائی۔ تو پھر کوئی الجھن باقی نہیں رہتی۔ جہانتک میرا خیال ہے شاعر نے بھی زنجیر رسوائی سے صدائے زنجیر ہی مراد لی ہوگی۔ مگر مساعد الفاظ فراہم نہو سکے۔

(۳۴)

گر نہ اندوہ شب فرقت بیاں ہوجائیگا
بے تکلف داغ مہ مہر دہاں ہوجائیگا

شرح "شامِ فراق کا اندوہ اگر میں نہ بیان کر سکوں تو یہ سمجھنا چاہیے کہ چاند کا داغ نہ تھا بلکہ میرے ہونٹوں پر مُہر تھی"۔ داغ مہ اور مُہرِ دہاں میں وجہ شبہ مسلم اور یہ بھی مسلم کہ سکوت کو مہرِ دہان ہونے سے استعارہ کرتے ہیں۔ لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر کوئی شخص چاندنی رات میں زیرِ سما پلنگ پر لیٹ کے اپنے ندیم یا جلیس سے جو یقیناً سوا معشوق کے کوئی اور ہی ہے اندوہ فرقت بیان نہ کرے تو داغ مہ اسکی مُہرِ دہان کیونکر ہو جائیگا۔ پھر شاعر تو فعل مستقبل استعمال کر رہا ہے مگر شارح اسکو ماضی کی معنوں میں لیکر شعر کو با معنے بنانے کی کوشش میں ہیں۔ اگر فعل ماضی استعمال کیا جاتا تو شارح کے بتائے ہوئے معنے تو کہاً و کرہاً مان لئے جاتے۔ اب تو شعر اپنی موجودہ ترکیب لفظی کے ساتھ ان معنوں کے قبول کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔

اب ہم حضرت شوکت کی شرح سے رجوع کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ "دوسرے مصرعہ میں داغ سے مراد داغِ معشوق ہے" (داغ معشوق سے شارح کی مُراد داغ الفت معشوق ہے) پھر پینے کے ساتھ اس اجمال کی تفصیل اسطرح فرماتے ہیں کہ "اگر شبِ فرقت کا غم چاندنی رات میں جبکہ معشوق سے ہم آغوش ہونا لطف دیتا ہے بیان نہ ہوگا تو معشوق کی فرقت کا داغ بے تکلف مُہرِ دہان ہو جائیگا۔ پھر اس مطلب کی توضیح اسطرح کیجاتی ہے "مطلب یہ ہے کہ دہن سے غم فرقت ہی بیان نہ ہوا تو دہن کس کام کا" اسپر اکتفا نہیں بلکہ آگے چل کے پھر فرماتے ہیں کہ "اور داغ مہ سے اگر ماہِ فلک مراد لیا جائے جب بھی معنے ٹھیک ہیں یعنے معشوق کی فرقت میں ماہِ فلک ایک داغ ہے لیکن اسکی چاندنی اچھی نہیں معلوم ہوتی، اور ماہتاب کا اثر بہ اعتبار نجوم خاموشی ہے پس داغ مہ خود مُہرِ دہان ہو گیا۔ اور مہر چونکہ سیاہ ہوتی ہے پس شبِ فرقت میں چاند کا سیاہ یا تاریک نظر آنا دوسرا محل ہے"۔

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ اس ایک شعر کی شرح میں کتنے معنے استعمال ہوئے ہیں حالانکہ استاد کا یہ کہنا ہے ع در فہم سخن رہ نبود اعنی را۔

اس لکھنے کے بعد ڈاکٹر بجنوری کا دیباچہ (صفحہ) بھی میری نظر سے گزرا تھا افسوس ہے کہ میں اپنے لااُبالی پن سے اسکی نقل نہ لے سکا اور کتاب جہاں کی تھی وہاں چلی گئی۔ اتنا یاد ہے کہ خدا بخشے

ڈاکٹر صاحب نے فلسفہ کے دریا بہا دئے ہیں مگر پھر بھی یہی کہونگا۔

رباعی

تو شعر مگو کلام لا یعنی را ور فہم سخن رہ نبود اعمی را
طفلیست یتیم در کنارت معنی نفطلے باید کہ پرورد معنی را
ضامن

ہمیں یہ معلوم کرکے بڑی مسرت ہوئی (اور یقیناً ہمارے بہت سے بھائی اس اطلاع سے مسرور ہونگے) کہ حضور نواب صاحب بہادر بھوپال نے اپنے مصاحب خاص برادرم میجر ممتاز علی خاں صاحب کو ترقی دیکر اب چیف آف دی اسٹاف کے منصب پر مامور فرمایا ہے ہمیں اُمید ہے کہ اس خوشی میں میجر ممتاز، اپنی ایسوسی ایشن کے سکرٹری صاحب کے نام گنگے" کا ایک پارسل اور ہمارے نام پاڑپوں کا دوسرا پارسل روانہ کردیں گے۔

برادرم ڈاکٹر عبدالرحمٰن (عثمان آباد) کے اچھے ہونے میں کسی کو کلام نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنے بھائیوں اور دوستوں کے پیٹ بھرنے کی خاطر وقت کی تاک میں رہا کرتے ہیں۔ رمضان کے آخری عشرہ میں ایک صبح کو ہمیں اطلاع ملی کہ حضرت شکم کی رسد رسانی کی غرض سے حیدرآباد اور سکندرآباد کو ایک کیا جا رہا ہے۔ سگرٹ سگار والے اور میوہ والے دال موٹھ والے انڈے والے مرغی والے اور خدا معلوم کون کون والے طلب کئے جا رہے ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد ہمیں معلوم ہوا کہ" اولڈ بوائے صاحب" اور ڈاکٹر صاحب کے دوستوں کی ایک بڑی قطار افطاری اور کھانے پر مدعو ہے۔ کئی آدمیوں نے ایک سے زیادہ دنوں میں جو اہتمام کیا تھا اس کو ان بھوکے بنگالیوں (معاف فرمائے، روزہ دار شریفوں) نے دم بھر میں صاف کردیا اور جتنا کھایا تھا کالج کی پرانی حکایتوں کی صورت میں اگل کر گھر چل دیئے۔

علیا حضرت سرکار عالیہ بھوپال کے خلف اوسط جنرل عبیداللہ خاں مرحوم کو ہمیشہ علیگڈھ اور علیگڈھ والوں سے محبت رہی۔ اسکی مثال ہماری درسگاہ کے بہت سے کاموں میں ملے گی اب ہمیں یہ معلوم کرکے خوشی ہوئی کہ مرحوم کے خلف اصغر صاحبزادہ رشید الظفر خاں صاحب کو انٹرمیڈیٹ میں تعلیم پانے کی غرض سے حضور فرمانروائے بھوپال نے علیگڈھ روانہ فرمایا ہے۔ اُمید ہے کہ اپنے عم محترم کے نقش قدم پر چل کر صاحبزادہ صاحب بڑی ترقی حاصل کریں گے۔

آتش جوان تھا!

برادرم! السلام علیکم۔ اولڈ بوائز ڈائرکٹری کیلئے آپکے سوالات حل کر دیے گئے ہیں۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ آپ نے ایک سوال اور بھی کیا تھا؟ جسکے جواب کے لئے میں نے تھوڑی سی مہلت مانگی تھی۔

ایکا سوال یہ تھا: کالج کے خوشگوار حالات میں سے اب بھی کسی کا نقش آپکے قلب پر باقی ہے؟

یہ سوال غالباً برادر مکرم مولوی محمد عنایت اللہ صاحب کی تحریک پر آپ نے اضافہ فرمایا ہے میرے لئے اس کا جواب دینا ضروری ہے، اور میں چاہتا ہوں کہ دوسرے برادران بھی اس کا لحاظ فرمائیں گے فکر فردا سے آزاد ہم چند بھائی جب مدرسہ میں پڑھا کرتے تھے، میں کالج فٹ بال الیون میں شریک تھا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب ہماری الیون کے کپتان سردار محمد اشرف خاں صاحب تھے، اور کرکٹ کی کپتانی مولانا شوکت علی صاحب کے سپرد تھی۔ نام پیدا کرنے کا شوق کہیے، یا مسابقت کی تمنا۔ ان دونوں ٹیموں میں رقابت موجود تھی۔ یہ رقابت صرف کھیل کی حد تک تھی، باقی ہم سب دوست اور بھائی تھے۔ اس زمانہ میں فٹ بال کے کھلنڈروں کا گزر کرکٹ فیلڈ پر سے ہوا کرتا تھا، ان گزرنیوالوں کی ضیافت طبع پھبتیوں کے ذریعہ ہمیشہ کیجاتی تھی ایکروز فٹبال الیون کے کپتان اور انکے ساتھیوں پر پھبتیوں کی بارش ہو رہی تھی، کہ ایک کھلنڈرے نے اپنے کپتان سے کہا، کہ روز روز کی مصیبت سے یہہ بہتر ہے، کہ ایکدن سارا قصہ چک جائے۔ وہ اسپر راضی ہو گئے! اُدھر شہ پاکر کرکٹ والوں کے قائد مسٹر (معاف فرمائیے مولانا) محمد علی بنے۔ مولسری کی درختوں کے قریب تمام کھلنڈروں نے ایک وسیع حلقہ بنا کر دونوں شہ زوروں کیلئے میدان تیار کر دیا۔ سردار اشرف خاں اور مسٹر محمد علی میں ٹکہ بازی شروع ہوئی۔ جوڑ برابر کے اترے تھے، اسلئے امید تھی کہ میدان جم کر ہوگا۔ مگر تھوڑی سی دیر میں مسٹر محمد علی کی

زبان سے "ٹائم ٹائم" کی صدا آنے لگی۔ بات وقت کی تھی۔ اسلیئے دوسرے برادران تفریحی درمیان آگئے۔ اور حریف کو روک دیا۔ مسٹر محمد علی سے رُک جانے کی وجہہ دریافت کیگئی، تو پاجامہ کا کوپین باندھتے ہوئے، انھوں نے اپنا ٹوٹا ہوا کمربند سب کے سامنے ڈال کر کہا کہ اس کمبخت کے سبب سے یہ گھڑی دیکھنی نصیب ہوئی۔ یہ سن کر سب نے فرشی قہقہہ لگایا، اور سردار اشرف خاں نے دوڑ کر مسٹر محمد علی کو گلے لگالیا۔ یہہ واقعہ جب کبھی مجھے یاد آجاتا ہے، بیساختہ ہنسی آجاتی ہے۔

طالب علمانہ زندگی کے دوسرے واقعات میں سے، ایک وہ واقعہ ہے، جب سر سیّد نے انتقال فرمایا۔ اور انکی قائمقامی کیلئے سب کی نظریں نواب محسن الملک (مرحوم) پر پڑنے لگیں۔ ایک محمد میر صاحب وکیل البتہ یہ رائے رکھتے تھے کہ سید محمود صاحب کالج کے لائف سکرٹری ہیں، ایسی صورت میں کسی دوسرے کا انکی جگہہ ہونا خلاف قاعدہ ہے۔ اس کام کیلئے اسٹریچی ہال میں ٹرسٹیوں کا جلسہ زیر صدارت سردار محمد حیات خاں صاحب منعقد ہوا۔ خود سیّد محمود صاحب بھی جلسہ میں موجود، اور ٹہلتے ہوئے۔

سب ٹھاٹھ پڑا رہجائیگا جب لاد چلے گا بنجارا

پڑہتے جاتے تھے۔ اسٹریچی ہال کے تمام دروازے بند تھے۔ لیکن چند طالب علموں نے بازو کے ایک دروازہ سے اپنے لئے جگہہ نکال ہی لی۔ سب ٹرسٹیوں نے اتفاق رائے سے محسن الملک مرحوم کا انتخاب کرلیا، تو خود نواب صاحب کو اسکی اطلاع کی غرض سے سید محمود صاحب مرحوم کیخدمت میں بھیجا۔ اپنے خلاف اس قسم کے فیصلہ کو سن کر کون شخص ٹھنڈے دل سے قبول کرسکتا ہے، یہی حالت سید محمود صاحب کی بھی ہوئی، اور نواب محسن الملک کا کالر پکڑ کر صحیح جواب کے خواہاں ہوئے۔ جب انھیں یقین دلایا گیا، کہ کام کی ابتری کے باعث انھیں پریسیڈنٹ، اور محسن الملک کو سکرٹری بنایا جارہا ہے، تو سید محمود صاحب محسن الملک مرحوم کے گلے مل کر خوب سا رو دیئے۔ دوسرے ٹرسٹی بھی اس سے اثر پذیر ہوئے، اور ان دونوں کے رونے میں شریک ہوگئے۔ اب گویا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ناوہ کے میر مظہر حسین مرحوم کے یہاں کی مجلس عزا، آج اسٹریچی ہال میں برپا ہے۔ جتنے طالب علم بازو کے کمرہ میں موجود تھے گھبرا کر سب ہال میں داخل ہوگئے۔ تھوڑی سی دیر میں یہ بے کیفی لطف و محبت سے بدل گئی۔ اسیقدر تقریبًا تمام ٹرسٹیوں نے دوپہر کا کھانا غائب کردیا تھا۔ اور شام کے پانچ بجے تک بھوکے کام

کرتے رہے تھے۔ اس موقع کی فرد کارروائی، جہاں تک یاد پڑتا ہے، ہمارے برادر مکرم صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب نے تحریر فرمائی تھی جلسہ برخاست ہونے کے بعد اسٹریچی ہال کے سامنے، ایچ اے مرزا فوٹوگرافر نے حاضرین کا فوٹو لیا تھا۔

تیسرا واقعہ ٹرسٹی صاحبان کے ایک اہم اجتماع کے موقعہ کا ہے۔ یہ تو یاد نہیں کہ اس موقعہ پر کیا مسائل تصفیہ طلب پیش آنے تھے، البتہ اتنی بات اب بھی یاد ہے کہ ملک کے بڑے بڑے لوگ جمع ہوئے تھے۔ ہم لوگوں (یعنی بقول آپ کے سوپ کمپنی والوں) نے ارادہ کیا کہ حیدر آباد دکن اور میرٹھ کے ٹرسٹی صاحبان کو بیا، پر مدعو کریں اور اس خیال کو عملی جامہ بھی پہنا دیا۔ جن بزرگوں نے اس روز کی چا، خوری منظور فرمائی تھی ان میں، نواب عماد الملک مرحوم، مولوی سید علی مرحوم، نواب سلام اللہ خاں مرحوم، اور شیخ وحید الدین صاحب بھی تھے۔ پچیس تیس آدمیوں کے مجمع نے اس روز چا، اور اسکے لوازمہ کے ساتھ خوب انصاف کیا تھا، اور سب کے سب گپ شپ میں مشغول تھے۔ ابھی تھوڑی دیر نہ گزری تھی کہ دس سے زیادہ آدمیوں کے ساتھ جن میں نواب اسمٰعیل خاں بھی تھے نواب محسن الملک کا گزر ہمارے کمرہ پر سے ہوا کھلانے اور کھانے کے وہ مرحوم بھی بڑے شوقین تھے۔ آتے ہی کمرہ والوں سے کھانے کی فرمائش کر دی۔ یہاں میدان پہلے ہی صاف ہو چکا تھا۔ ہم سب بھائیوں اور ہمارے ساتھیوں نے بغلیں جھانکنے کی، وقت گزاری کرنے کے بجائے، یہ مناسب سمجھا کہ ہر چہ بادا باد، ڈائننگ ہال کے دودھ اور ڈبل روٹی شاپ کی پیٹی پر دھاوا کیا جائے۔ ایسا ہی کیا گیا، اور تھوڑی دیر میں سب انتظام مکمل ہو گیا۔ دوسری ناخواندہ جماعت نے بھی اس خوانِ یغما میں شرکت کی اور سیر ہو کر کھایا۔

یہ قصہ تو وقت کے وقت ختم ہو گیا۔ مگر دوسرے روز ہم لوگوں کی طلبی مسٹر ماریسن کے اجلاس پر ہوئی۔ ہم ملزموں نے بات جیسی تھی ویسی ہی بیان کر دی۔ ماریسن صاحب نے اس داستان کو سنکر قہقہہ لگایا، اور فرمانے لگے۔

I like the spirit

یہ حکایت تو ڈائننگ ہال کے دودھ کی تھی جب پیسٹری کی روداد سامنے آئی تو ہم لوگوں نے کوشش کی کہ بل نواب محسن الملک کے پاس بھیجا جائے ایسا ہی ہوا۔ وہ مرحوم اس جسارت سے بہت محظوظ ہوئے، اور نہایت خوشی کیساتھ اس رقم کو ادا فرما دیا۔ بھئیا! اس کے بعد میری خورجی خالی ہے۔ والسلام

محمد احمد

ٹیگور میں جو خصوصیات ایک شاعر کی حیثیت سے پائی جاتی ہیں انکو مجملاً "رنگ تصوف" سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ وجدانیت یا تصوف کی تعریف مشکل ہے کیونکہ وہ کوئی خاص مذہب یا اصول فلسفہ نہیں ہے۔ ایک نقاد تصوف کی یہ تعریف کرتا ہے۔

"حقیقت کا روحانی انکشاف جو احاطہ ادراک سے بالاتر ہے۔ شاعری کی بنیاد عقیدہ پر ہے نہ کہ عقل پر۔ مشہور شعراء یا تو خواب تصورات میں گم رہے ہیں یا تصوف میں، وہ اس وجدان سے مسرت آگین ہو سکتے ہیں، جس کو عام طور پر ہم دیکھنے یا سمجھنے سے عاری ہیں"۔ پس تصوف سے مراد شاعر کے ذہن کی خاص حالت۔ خاص تجربہ اور اسکی وہ اعلیٰ قابلیت ہے جس سے وہ اپنی وجدانیت کو شاعرانہ زبان میں قلمبند کرتا ہے۔

ٹیگور کی شاعری میں شاعرانہ تصورات کے علاوہ فطری زندگی اور حیات انسانی کی تشریح بے مثل ہے اسکے نزدیک فطرت معبود کا ملبوس ہے۔ دنیا کے مشہور فلسفی صوفیوں کی طرح اس کا بھی یہ عقیدہ ہے۔ "اللہ باقی من کل فانی" وہ اختلاف میں یکجہتی دیکھنا چاہتا ہے کیونکہ اسکی دعا یہی ہے کہ اسے "اس ایک کا جلوہ کل کے تماشہ میں دکھائی دے"۔ ہندوستان کے فلسفیوں کی طرح وہ خدا کو اپنے ہی میں پاتا ہے کیونکہ وہ پوچھتا ہے۔

میرے مالک کیا تو اپنی تخلیق اپنے ہی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا ہے؟ تو اپنا سوہن روپ مجھ میں پاتا ہے

اسنے فطرت انسانی کا غائر مطالعہ کیا ہے "معصوم" اور اسکے کھیل ہم ہر روز دیکھتے ہیں کہیں اسکی ابتدا اور انتہا کے متعلق عموماً دماغ پر زور نہیں ڈالا جاتا لیکن اس زبردست صوفی کے نزدیک۔

"لا انتہا ہی گیتی کے ساحلوں پر بچے ملتے ہیں آسمان پر طوفان اٹھتا ہے، جہاز بھنور میں گھر جاتے ہیں اور فنا

فضا پر محیط ہے لیکن بچے کھیل میں مصروف ہیں۔ لا متناہی گہتی سمندر کے ساحلوں پر بچوں کا عظیم الشان جمگھٹ ہے۔"

معصوم جو اسکی ایک مشہور نظم کا ہیرو ہے اپنی حکایات کا ذکر کرنے میں اپنی ماں سے کہتا ہے۔

"اماں میری کشتی کا بادبان بند رہیگا"۔

کیا اس سے یہہ مقصود ہے کہ بچہ ماں کو زندگی کے بحر کی دشواریوں کے طے کرنے میں مدد دیگا؟ ماں کے نزدیک معصوم اسکے تمام خیالات کا مرکز ہے۔ وہ دیوتا ہے جسے وہ اپنے خانہ دل میں جاگزیں کئے ہوئے ہے۔ زندگی کی ناپائداری میں اگر اسکا کوئی تکیہ ہوسکتا ہے تو وہ اسی معصوم کی محبت ہے۔ ٹیگور کے ایک قصہ کا "سورن" ایک لڑکا ہے جو اپنی ماں سے دور اپنے ماموں کے پاس بغرض تعلیم جاتا ہے۔ اسکا ماموں نہایت شفقت اور محبت سے اس کا خیال کرتا ہے لیکن لڑکے کو اجنبیت معلوم ہوتی ہے۔ وہ اپنی ماں اور گھر کیلئے مضطرب ہے لیکن اسے تعطیلات کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ اس کا اضطراب اسقدر بڑہجاتا ہے کہ آخر کار وہ بیمار پڑ جاتا ہے اور بیہوشی طاری ہوجاتی ہے اور اس عالم میں اسکے منھ سے کوئی کلمہ نکلتا ہے تو صرف یہی کیا ماموں جان تعطیلات آگئیں" آخر کار ماں اس حالت میں پہونچتی ہے جسکی گہرائیوں کو جاننا آسان نہیں۔ اس کا "سندر معصوم" آخری دفعہ آنکھیں کھولتا ہے ماں کو دیکھکر خوش ہوتا ہے اور یہہ کہہ کر "اماں تعطیلات آگئیں" ہمیشہ کیلئے آنکھیں بند کرلیتا ہے۔ پڑہنے والے پر یہہ ظاہر ہوجائے گا کہ اس سے مراد انسان کی روح کا دورہ ہے جو زندگی کی جد وجہد کے اختتام پر عارضی مدت کے بعد اپنے مبدا اصلی سے جا ملتا ہے۔ پس ہم دیکھتے ہیں کہ ٹیگور کی تصانیف میں وہ گہرے معنی پنہاں ہوتے ہیں جن کو ہم پہلی نظر میں نہیں جان سکتے۔ یہی وہ راز ہے جس نے اسکے کلام کو وہ مرتبہ بخشا جو آج دنیا جہان کی شاعری میں اسے حاصل ہے۔

بالآخر یہہ کہا جاسکتا ہے کہ ربندر ناتھ ٹیگور دنیا کا ایک ممتاز پیغامبر شاعر ہے۔ وہ روحانیت محبت اور اخوت کا پیغام پہونچاتا ہے۔ شاعر کے نغموں سے پڑہنے والے اپنی سمجھ کے مطابق معنی نکال لیں مگر انکے اصل معنی اسی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ اسنے شاعری میں روحانیت پیدا کردی۔ وہ شاعری میں ان ہی مقاصد کو پیش کرتا ہے جن کا علم دنیا کے تمام پیغمبروں نے بلند کیا تھا اور اسکے لئے تکلیفیں اُٹھائی تھیں۔ زمانہ موجودہ میں اسکی شخصیت ایک خاص وقعت رکھتی ہے۔ اسکی زندگی کا مقصد مشرق و مغرب میں اتحاد پیدا کرنا ہے۔ اور ایک

حد تک وہ اس میں کامیاب رہا ہے۔ اسکے نزدیک کسی انگریزی شاعر کا یہ خیال کہ "مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب اور دونوں کبھی ایک نہ ہوسکیں گے" دعوے باطل ہے۔ وشوا بھارتی اسکے اس خواب کی مجسم تعبیر ہے۔

اعلیٰ اوصاف (اوصاف حمیدہ) کسی خاص قوم یا فرقہ کا مخصوص حصہ نہیں ہوتے لیکن یہ دیکھا جاتا ہے کوئی خاص صفت کسی خاص قوم میں بدرجہ اتم موجود ہوتی ہے۔ مغرب ہمیشہ سے آزادی کا گہوارہ رہا ہے اور آزادی کی روح جواب مشرق میں پائی جاتی ہے مغرب ہی کی منت پذیر ہے۔ ٹیگور کے یہاں آزادی کی خواہش بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔ وہ ڈھکوسلوں اور خلاف فطرت باتوں کا قائل نہیں۔ وہ [illegible] حالت [illegible] وہ یہ ہے۔

"جہاں من بے خوف اور سربلند ہو جہاں علم کی ارزانی ہو۔
جہاں آپس کے جھگڑوں نے عالم انسانی کو ٹکڑے ٹکڑے نہ کر دیا ہو۔
جہاں عقل و شعور کی شفاف نہر عادت کے جنگلوں اور ریتیلے صحرا میں گم نہ ہوگئی ہو۔
اس آزادی کی بہشت میں میرے پیارے وطن کو بیدار کر"

اگر اسکی محبت ذات (خودی) کو مغرب سے منسوب کیا جاسکتا ہے تو اسکی عقیدت جو اسکے بربطی نغموں میں نمایاں ہیں، خاص طور پر ہندی ہے اسکا صوفیانہ رنگ مشرقی ہے لیکن انسانیت مغربی ہے۔

جب وہ تماشا گاہ عالم میں اس ایک کا جلوہ دیکھتا ہے تو وہ ہندی فلسفی کا ہم خیال ہے لیکن جب وہ زندگی کیلئے کوشاں نظر آتا ہے تو پھر ہندی فلسفی کا ساتھ چھوٹ جاتا ہے۔ اسکے نزدیک بخشش اسمیں نہیں ہے کہ خود کو بھولجائے۔ وہ کہتا ہے۔

"بس اپنے حواس معطل نہ کرونگا۔۔۔۔ انہی کے ذریعہ محبت حاصل ہونگے"

اس بناء پر اسے انسانیت کا شیدائی کہنا بجا ہوگا۔ اسکی غیر فرقہ بندی یا آزادی مذہب کا پتہ اس سے چلتا ہے کہ جہاں وہ مغرب کی خامیوں کو بتلاتا ہے وہاں مشرق کی کوتاہیوں پر بھی انگشت نمائی کرتا ہے۔

"قومیت" سے جو مراد مغرب میں لیجارہی ہے اور جسکی پیروی مشرق میں ہورہی ہے اس سے ٹیگور کو کوئی دلچسپی نہیں۔ مغرب کا سیاسی اور تجارتی غلو اسکے نزدیک موجودہ تہذیب کی برائی کی جڑ ہے اسکی

دُعا یہی ہے :-

" انسان روحانیت میں غرق ہو کر مادیت کے ظلم سے آزاد ہو جائے "

کارلائل کی طرح ٹیگور بھی یہہ محسوس کرتا ہے کہ عالم انسانی تنزل پذیر ہے۔ کیونکہ وہ سلما مادیت کی دیوی کے مندر میں عود جلا رہا ہے۔" اسکے نزدیک دنیا کی لامتناہی قوتیں اپنی حقیقت کا اظہار حُسن میں کرتی ہیں۔۔۔۔۔حسن اور صداقت تمام ہیں"

شاعری سائنس۔ اور سیاسیات میں روحانیت کا پیدا کرو دنیا ہند جدید کے کارناموں کا طرۂ امتیاز ہے۔ کیا یہہ ہندوستان کی تہذیب کی قابلیت کی کافی صداقت نہیں کہ بیسویں صدی میں جب کہ ہم اپنے اسلاف کیطرح سیدھی سادھی بلند خیال زندگی بسر نہیں کرتے تب بھی ہندوستان کو دنیا میں اپنے تین بلند پایہ سپوتوں کے مقاصد و کارناموں کے بدولت اعزاز حاصل ہے۔ ان میں ایک مشہور سائنس داں دوسرا سر آور دہ صوفی شاعر اور تیسرا اعلیٰ اخلاق کا حامی ہے ہر ایک عالم انسانی کے ناز تحسیر۔ اور تحسین کا مستحق ہے۔

افضل حسین فاروقی

برادر عزیز مسٹر خواجہ علاء الدین (بھوپال) جن کو ہاکی سے ہمیشہ شوق رہا، اور جو کالج کے کھلنڈروں کی صف اول میں رہ کر ایک مدت ہوئی Colour holder بن چکے ہیں ان کو کلکتہ کے انٹرنیشنل میچ میں کلکتہ طلب کیا گیا تھا لیکن ذاتی وجوہ سے انہیں شرکت کا موقعہ نہ مل سکا۔ البتہ یونیورسٹی ٹورنامنٹ میں علیگڈھ جا کر ہاکی ضرور کھیلا کرتے ہیں۔ اسپورٹس کے باب میں ہم اپنے عزیز بھائی مسٹر ناظر حسن انصاری (گوالیار) کا مراسلہ آئندہ شایع کریں گے، جس کی جانب توجہہ کرنے کی ان تمام بھائیوں کو ضرورت ہے، جن کو تفریحی مشاغل سے دلچسپی ہے۔

ویرہ دون اور سہارنپور کے خوش ذایقہ چاولوں کے شوقین حضرات، حافظ منظور احمد (علیگ) سے رائس سپلائی ایجنسی، سہارنپور کے پتہ پر خط و کتابت فرمائیں۔

من کی موج

گولکنڈہ کی شرقی فصیل پر کھڑے ہو تو اک عجیب منظر آنکھوں کے سامنے کھل پڑتا ہے وامن ہی میں ڈراونی خندق ہے۔ یہیں ان فدائیاں عالمگیر کی آرامگاہ بھی ہے جنھوں نے جانیں دیکر قلعہ لیا تھا! انسان! اُف، یہ تیری خونی ہوسناکی!! جو شفیق باپوں، عزیز فرزندوں، پیارے بھائیوں اور محبت دار خاوندوں کے خون سے سینچی جائے! حیرت سی حیرت ہے کہ یہاں خوش عیش تانا شاہ سے نازک مزاج اور خوش صفات عالمگیر سے خداشناس کی پیاس بھی بندگانِ خدا کے ہی خون سے بجھی!

فصیل سے ذرا آگے پل کے بائیں طرف "لنگر حوض" والے تالاب کا مصفا آئینہ سندر نیچر کی تصویر لے رہا ہے۔ دائیں طرف دہان کے مخملی کھیت ہیں جن کے نرم نرم فرش پر فطرت کی دیوی ایک رنگیلے شاعر کے ساتھ ساتھ یوں "رخ سے" کھولے چلی آرہی ہے:۔

وہ بال سنہری لہرائے
سورج نے صورت دکھلائی
وہ پرکاش کے طوفاں آئے
نور میں جگتی ساری نہائی
نور کی نہریں رنگ کی لہریں بول اٹھی سب ہے منھ سے خدائی!

پرندکی سہانی چہکار نسبتاً کم ہو گئی۔ اب یا تو انکے غول کو غول سدھارنے لگے، ایک وقت سی دوسرے پر جو تھی کی

سلہ اس مضمون میں جس قدر نظم کا حصہ ہے اسمیں مولوی عظمت اللہ خاں مرحوم کے کلام کو کام میں لایا گیا ہے۔

گل اندوزسی کیطرح جا رہی ہیں! تالاب پر آبی پرندوں کی بہار ہے! غابونچی ٹکڑیاں تاوے کاٹ کاٹ کر جُدا
ایک رخ اتر رہی ہے وہاں کے لہلہاتے کھیتوں میں کلچائی کی گھما گھمی ہے، اندھرا دیس کی سندر
پتریوں کی دور دور ایک لنگتار چلی گئی ہے، جو کویل کیطرح کوکتی بھی جاتی ہیں گیت کا نچوڑ "حسن وعشق"
کے معاملہ سے زیادہ نہیں مگر ہندی نزاکت نے ناز و نیاز کی غضب گھلاوٹ بھر دی ہے!

"چندرماں! دیکھ تو کتنی رات آگئی! مجھ پیت کی ماری کی سجھ لا! اب بھی سونی ہے! کہیں
اسی بات کا تو تیرے دل پر بھی داغ نہیں ہے!"

"للہ تو یونہی انھیں دیکھے جا، شاید بیرن کو مناتے مناتے وہ بھی تھک کر تجھے دیکھ لیں! لاؤ،
یوں ہی آنکھیں چار ہو جائیں!"

"اچھے چندرماں! اپنی دودھ سی کرنوں کا انپر چنور رلا! میں دکھیاری درد کی ماری تیرے پیر
پڑوں گی، لونڈی بنوں گی۔ تجھ پر سے جوئین کروں گی، آتما واں دوں گی!!"

تلنگانہ کے یہہ گداز بول جن کا خلاصہ اوپر دیا گیا، سُریلی آوازیں پرند کے گیتوں کیطرح پھیل رہی ہیں،
جس سے روح پر حسین جذبات کا ایک رنگ آتا ہے، ایک آجاتا ہے۔ ذرا سوچئے تو ایک بے کل پرشباب سے
کے یہہ ہندی ارمان ہیں بھی کتنے فطری اور محبت لیئے!

صحت و اطمینان کی یہہ بجلی پتریاں بھی، واقعہ یہہ ہے، حسن سے خالی نہیں۔ محنت کے سڈول اعضا
میں صحت کی سج دھج اور گاؤں کی سادگی ہے، جو انکی پشتینی دولت ہے۔ چہروں پر سوچ کی اداسی کی جگہہ
وہاتی بھولپن اور خوشی کا نور پڑا برس رہا ہے۔ ساتھ ہی جائز غرور کا موہن وقار بھی ہے کہ بچہ، بوڑھا، مرد،
عورت، امیر، غریب سب کے سب ہمارے دست نگر ہیں! انکی ساری زندگی اپنے پالے پوسے معصوم
دہاتی کی سی ہوتی ہے، جو دنیا کی ہوا کھا کر دنیا سے الگ تھلگ بھی رہتا ہے اور اس کا پیٹ بھی پالتا ہے۔
یہہ اُن مُورکھ محسنوں کی بہو بیٹیاں ہیں جن کا اوڑھنا بچھونا صبح و شام کھیت ہے اور جن کے طفیل جابن
کی کھیتی پھولتی پھلتی ہے! ہائے، وہ مقصد زندگی جو دنیا کی بہت ساری فضول باتوں سے توڑ کر یوں کلم بنادے۔
فجر کی دیوی نے ابھی افق کی سیج پر کروٹ لی نہ لی کہ ان کام کی رسیاؤں کو کھیت کی محبت

کھینچ لیتی ہے۔ بے فکر دنیا، ابھی لمبی تانے بے خبر ہی ہے کہ یہہ گاؤں کی ولاریاں اسکے پیٹ پالنے کی فکر میں لگ جاتی ہیں۔ صبح کا نور چھا جوں برس رہا ہے۔ ہوا کے ٹھوکے گدگدا رہے ہیں یہہ اس لطف میں ڈوبی ہوی تو ہیں لیکن کام سے غافل نہیں! تن من دہن اپنے آپے کی فکر سے زیادہ دوسروں کی غذ مٹگزاری میں لگا ہوا ہے! غرض اندھرا ماتا کی گود میں دیکھتے دیکھتے یوں ہی انکے آرام کا وقت بھی آجایا کرتا ہے۔ اور جب شام کی اوس خاموشی سہج سہج اپنا رنگ جمانے لگتی ہے! تو یہہ بھی اپنے زمروں میں ماحول سے نکل کھڑی ہوتی ہیں۔ ڈوبتے سورج کے سنہری آنچل سروں پر پڑے ہوئے ہیں اور یہہ خوشی خوشی اسطرح گھر واپس ہو رہی ہیں، جیسے حیدرآباد کے سارے روایتی "حسن" ہی سمیٹ کر لئے جاتی ہیں!

اس لطیف منظر سے اِن بھولی بھالی گاؤں کی دیویوں کی محنت وایثار پر رشک آنے لگا، جو ہے بھی یہہ کہ دنیا، کا سب سے مقدم کام ہے! ساتھ ہی خیال ہوا ان کام کی میتوں کے مقابلہ میں اپنا کیا دھرا عشر عشیر بھی نہیں رہتا۔ کیونکہ انکے شریف کام میں جہان کی بھلائی نظر آئی، جس میں الٰہی شان بڑی جھلک رہی تھی! یہہ جائیکہ ہم میں سے بہت سے متعلیق شہریوں کی لمبی چوڑی باتیں نری باتیں ہی باتیں ہوتی ہیں جو مداریوں کی طرح اسٹیج کر کر کے کاغذ، قلم دوات کی مشیخت پر اینٹھے جاتے ہیں۔ حالانکہ یہہ پیٹ بھرے کی باتیں ہیں۔ اور اُن سے پیٹ بھر جاتا ہے۔ دو وقت کھانا نہ ملے تو پھر ان کاغذی گھوڑوں کی حقیقت معلوم! ویسے بھی ہماری بہت سی باتیں کارآمد تو درکنار معصوم بھی نہیں گنی جاسکتیں۔ اسبات کے لئے تو سب کی نظر میں یا تو اس خوش و خرم انسان ہی کیطرف اٹھتی ہیں۔ جو بھلائی کے بیج بوتا اور محنت کے پسینے سے انھیں سینچتا رہتا ہے! یا نہیں تو پھر ایک ایک کر کے دوسرے بھی ایسے ہی کام سامنے آنے لگتے ہیں جو ثمرحیات ہیں۔ باقی رہی اور باتیں تو یہہ سب کی سب بے فکری کا بے تکاپن ہیں! جس سے اکثر سوائے مشکلات اور انکار کے کچھ حاصل نہیں۔ یہی چیز ہے جس سے، ایک بہشت نصیب شاعر کو جگ میں کام کی ہی ساری برکت نظر آئی!

شاعر نے "جیت کی کنجی" عطا کرتے وقت کام کی بڑی پیاری اور پُر زور تعبیر کی ہے۔ دلی کی سادی زبان میں گویا خیال کی نتھا‌ئی پینگیں بڑھائی ہیں۔

"کام عبارت ہے سرگرمی سے کام دماغی بجلی ہے۔
اس زور سے ہر مشکل ٹلتی ہے۔
سارے زوروں کا زور یہی ہے یہہ ہی جیت کی کنجی ہے۔
کام سے دنیا آگے چلتی ہے"

یہہ سرگرمی' یہہ دماغی بجلی' جیت کی کنجی سہی' مگر ایسے دکھ سکھ میں الجھی ہوئی ہے جن کا دوسرا نام زندگی ہے' شاعر کا یہ خیال صحیح خیال ہے کہ اس دکھ سکھ کی دھوپ چھاؤں میں مردانہ وار رہنا سہنا ہی "زیست" ہے۔

"دکھ اک سکھشا ہے جان کو بن دکھ آرام نہیں چین نہیں
سکھ خواب ہے گویا دکھ بیداری
ہر کام میں دکھ ہی دکھ ہیں سکھ ہے گر کام نہیں چین نہیں
ہے کام کی جگ میں برکت ساری"

<<<<<<<<<

سکھ کا منشا ہے بس اتنا ہی سکھ کام کی ہے تیاری
سکھ سے تازہ دم کام کے قابل
دن بھر کام کا پھل رات کی نیند ہے نیند کا ثمر بیداری
سکھ یا دکھ یکساں ہستم قاتل"

<<<<<<<<<

زیست کے معنی ہیں درد کا سہنا سکھ اٹھانا مروانا
ڈر کا پھل دنیا ڈر کا مٹانا
جان ہتیلی پر رکھنا جینا ہارنا جی کا مرجانا
جان کا کھو دینا جان کا پانا"

خیر، تو دکھ سکھ کا یہہ گہرا مطالعہ گویا بالفاظ دیگر مطالعہ زندگی ٹھیرا جس میں یاں سے واں تک کام کی روح دوڑی ہوئی ہے۔ لیکن شاعر کا دل انتہائی باتوں کا کھوجی اور ہر بات کی لم چاہتا ہے۔ اسلئے اپنی نگاہ کو محدود کرنا بدترین گناہ سمجھتا ہے۔ اُس کا ہر مراقبہ حیات کو لطیف سے لطیف تر، اور اسکی ہر داخلی کیفیت جذبات کو بلند سے بلند تر بناتی جاتی ہے۔ اس کا حوصلہ چاہتا ہے کہ کائنات کی پہیلیوں کو وہ دن کیطرح صاف و روشن کردے۔ مگر عقل کی حد اسپر پردے پر پردے گرا کر حقیقت کو رات کیطرح چھپاتی جاتی ہے۔ غرض شاعر کے بطون کی یہہ کیفیت ایسی دہوپ چھاؤں ہے۔ جو دن رات کی طرح اٹل ہے۔ شاعر نے زندگی کو "کام" کا بنایا تو فطرۃً جی سیر نہوا۔ اور آگے بڑہا۔ حوصلہ مند بصیرت چاہتی ہے کہ حقیقت کی نقاب الٹ دے مگر جیسا کہ اس راہ میں اچھے اچھوں کا حال ہوا۔ انکی آنکھوں میں بھی نور الٰہی سے ایسی چکاچوند آگئی کہ زندگی "پہیلی" نظر آنے لگی۔ جس کا اظہار ایمان کی یہہ ہے "کہ ایمان کی نشانی اور عین بن گئی ہے۔

"ہے ایک پہیلی اپنا جینا ایک معمہ مرجانا
اک راز یہاں کا آنا جانا
خون جگر پینا یو جھنا اسکا منت کا گویا غم کھانا
آخر یہی جانا کچھہ نہیں جانا"

<<<<<<<<<<<

ان خیالات سے طبیعت میں خلجان پیدا ہوگیا تھا۔ لیکن سچ یہہ ہے کہ ہر کارے و ہر مردے۔ ہمارا کچھ ہی کام کیوں نہو، خلوص نیت سے ہو تو وہ کہیں سے کہیں پہنچ جاتا ہے۔ کائنات کی کوئی شے بیکار نہیں۔ مگر اُسے کام کا بنانا ہمارا کام ہے! اسلئے خلوص کی دو سطریں، دو بول بھی، بشرطیکہ نیک نیتی سے نکلے ہوا، کام کے ہیں۔ بس، شاید سورج خاصا اونچا ہو آیا۔ انسان سے لگا کر چرند پرند تک اپنے اپنے کام سے لگ چکے، خیال کے پر یکایک پلٹا کھا جانے سے میری بھی ڈہارس بندہی۔ خدا عمل کی بھی توفیق دے!

سید وزیر حسن

یادِ ایّام

تکلف عزازیل را خوار کرد

راوی کہتا ہے کہ "قدردان دیور" اپنے بھائیوں کی نظروں میں بہت مقبول ہوا۔ مگر معلوم نہیں کہ صرف قدردان دیور کی قدردانی پسند خاطر ہوئی یا صرف شریف بھابی جان کی مہربانی یا انصاف پسند ناظرین نے دیور اور بھابی کو تنہا چھوڑ کر چٹپٹے کبابوں کا نمکین مزہ اُٹھایا۔ اگر اس ڈگر ہی کا مصلح معدہ اور مرغوب مضمون مطلوب ہے تو جناب :۔

نہ ہر زن زن است و نہ ہر مرد مرد
خدا پنج انگشت یکساں نہ کرد

نہ ہر دیور ایسا قدرداں ہوسکتا ہے نہ ہر بھابی ایسی مہماں نواز، نہ ہر حاضر الوقت ایسا نمک حلال نہ یہ کہ ساوی مناسبت کے ساتھ کباب ہی مزے کے ہوں، نہ انکے ساتھ انصاف کرنیوالا بھی مخلص ہو اور نظم بھی فوراً تیار ہو جائے مختصر یہ کہ جبتک دوبارہ اسی قسم کا خوشگوار اور خوش ذائقہ واقعہ پیش نہ آئے کسی دیگر تحریر کا ارادہ کرنا مشکل ہے۔ وہ زمانہ تو گیا جب دروغ مصلحت آمیز پر عمل کر کے رات دن سبکی اکٹروں ڈاکٹروں اور استادوں سے جھوٹ بولنا پڑتا تھا یا ڈبیٹنگ سوسائٹی

میں امتیاز حاصل کرنے کیلئے جھوٹے اور فرضی دلائل پیش کئے جاتے تھے! اب وہ زندگی ہے نہ جھوٹ بولنے کی مشق ہے، اسلئے بلا کسی واردات کے بوستانِ خیال کے مصنف کا منہ چڑھانا یقیناً اگر غلطی نہیں تو کوئی عقلمندی بھی نہیں ہے ۔

محض اشتیاقِ ناظرین کی خاطر ایسا خوش ذائقہ واقعہ کہاں سے لایا جائے۔ قند مکرر نہیں تو منظر بھائی کی "کباب مکرر" کی فرمایش بڑی ٹیڑھی کھیر ہے اور پھر شرط یہہ کہ رنگ بھی وہی اور لطف بھی وہی ہو۔ میں نے تو اپنے طور پر مصمم ارادہ کیا تھا کہ منظر بھائی کے ارشاد کا بہترین جواب خاموشی ہی ہوسکتا ہے (برا نہ مانیگا) مگر دوبارہ حکم نافذ ہوا۔ مجبورًا دماغ اور حافظہ پر زور دینا پڑا اور ایک واقعہ فورًا یاد آگیا۔ خوش ذائقہ یا خوشگوار واقعہ ہے یا نہیں اسکا فیصلہ خود منظر بھائی فرمالیں لیکن اسمیں شک نہیں کہ یہہ واقعہ اگرچہ رنگ میں مختلف مگر معدودے کی حد تک مماثلت ضرور رکھتا ہے۔ اور چونکہ تعمیل ارشاد میں پیش کیا جارہا ہے اسلئے اگر اوروں کو نہ سہی تو منظر بھائی کو مجبورًا اور اخلاقًا ماننا پڑے گا کہ کبابوں کا لطف نہو مگر دلچسپ ضرور ہے۔

تکبر عزازیل را خوار کرد
بزندانِ لعنت گرفتار کرد

شیخ سعدی علیہ الرحمہ کے شعر کے متعلق اکثر احباب کہتے ہیں کہ انسان چونکہ غلطیوں سے مرکب ہے اسلئے کچھ عجب نہیں کہ شیخ علیہ الرحمہ نے خود غلطی نہیں تو سو۱۰۰ میں ننانوے ۹۹ بار کاتب نے ضرور غلطی کی ہے اور "تکلف" کے بجائے "تکبر" لکھ دیا ہے۔ وزن کے اعتبار سے تکلف بھی بلا تکلف موزوں ہوجاتا ہے اور معنی کی اعتبار سے بھی یہ سمجھا جاسکتا ہے کہ شیطان نے حضرت آدم کو سجدہ کرنے میں تکلف کیا اسلئے خوار ہوا۔ بہرحال ہماری غرض بھی یہاں تکلف سے ہے تکلف ہی کو ترجیح مناسب ہے، اور اسمیں کوئی ہرج نہیں کہ فرض کرلیا جائے اسلئے کہ فرض کرنا کوئی گناہ نہیں دوسرے یہہ کہ زمانہ تعلیم میں بھی ہمیشہ استادوں نے فرض کرنے کی تعلیم دی ہے اور پڑھے ہوے پر عمل نہ کرنا بڑی غلطی ہے (یاد کیجئے اسباق اقلیدس، جبر مقابلہ۔ وغیرہ وغیرہ) خلاصہ تحریر یہہ کہ فرض کر لیجئے کہ تکبر کے بجائے تکلف ہی ہے تو اب دیکھنا یہہ ہے کہ روزانہ زندگی میں تکلف کہانتک کامیاب ہوسکتا ہے۔

اس واقعہ کا جو آگے آئیگا صحیح سنہ تو یاد نہیں مگر زمانہ وہی تھا جب کالج اور اسکول کے لڑکوں میں رہنے کی تفریق نہ تھی، اور ایک بارک میں کالج والوں کے ساتھ اسکول کے لڑکے بھی رکھتے تھے۔ دوسرا اتا پتا اس واقعہ کے زمانہ کا یہہ ہوسکتا ہے کہ اسوقت تک نواب وقار الملک مرحوم سکرٹری نہیں ہوے تھے اور مذہبًا نہیں تو اسپوزیشن اور جرمانوں کے اعتبار سے اسکول کے لڑکوں کیلئے تین وقت کی اور کالج کے لڑکوں کیلئے صرف دو وقت کی نماز

فرض تھی۔ آخری بلکہ اہم توضیح اُس زمانہ کی یہہ بھی ہوسکتی ہے کہ اُسوقت "ممتاز" مشہور فیرینی والا زندہ تھا اور بلا ناغہ اپنا خوانچہ سر پر لیکر روزانہ گشت لگایا کرتا تھا۔

حُسن اتفاق سے اسی زمانہ میں ایک خاندانی امیرزادہ غالباً لکھنؤ یا اسکے اطراف کے رہنے والے داخل اسکول اور یکی بارک کی ۶ ، ۷ ، یا ۸ نمبر کے کسی کمرہ میں مقیم ہوے۔ نوگرفتار تھے کبھی بورڈنگ کی زندگی سے سابقہ نہیں پڑا تھا شرافت کے ساتھ ساتھ باہمی تعلقات بڑہانے کا شوق اور ہر دلعزیزی پیدا کرنیکا ذوق تھا۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں؛ ہم لوگوں نے نعمت غیر مترقبہ سمجھ کر خوب آؤ بھگت کی۔ یار لوگوں کی عید آگئی اور حلقۂ احباب کی وسعت کے ساتھ ساتھ اخلاق اسقدر وسیع ہوتے گئے کہ انکی سیرچشمی کی خاطر بعض بعض اوقات نئے دوستوں کو ڈائننگ ہال ایسے اہم مقام کو بھی خیرباد کہنا پڑا۔ اچھے اور بڑے گھر کے لاڈلے بیٹے تھے اور امیرانہ احتیاطوں کے عادی تھے گھر پر عمدہ کر شوربا چپاتی نپا تلا ملتا تھا۔ معدہ کو اس سے پہلے کبھی آزمائش کا موقع نصیب نہیں ہوا تھا نئی آزادی ملی تھی۔ پیسہ کی کمی نہیں تھی قوائے ہاضمہ کے نشو و نما میں ترقی ہونے لگی اور کشادہ دلی سے احباب کی خاطریں ہونے لگیں۔ تعریفوں کے پل باندہے جاتے تھے خوانچہ والوں کی منت پوری ہوتی تھی، اور "ممتاز" فیرینی والے کی خاص طور پر سرپرستی فرمائیجاتی تھی۔ ایکدن خاص دعوت کا مقرر ہوا۔ مہینے کی شروع تاریخوں کی وجہ سے منی آرڈر ایک ہی دن قبل آچکا تھا۔ امتحان کا زمانہ سر پر تھا دماغی ترقی بھی منظور خاطر تھی اسلئے دعوت کیلئے بادام کی فیرینی کا انتخاب ہوا اور حسبِ ممتاز کو مطلع کردیا گیا۔ دعوت کا مسئلہ اور فیرینی کا انتخاب بحث و مشورے سے بالاتفاق و بلا اختلاف طے پایا کہ آجتک گورنمنٹ آف انڈیا لیجسلیٹو اسمبلی کا کوئی رزولیوشن بھی اس شان سے کبھی پاس نہوا ہوگا۔ الغرض شام کے وقت کے ساتھ ساتھ وہ نیک گھڑی بھی آپہونچی اور ممتاز بھی حاضر ہوگیا۔ احباب نے خوب دل کھولکر نہایت خلوص سے فیرینی کھائی اور اسرور سب سے زیادہ خود میزبان صاحب نے ممتاز کو ممنون فرمایا تعریفیں ہوئیں بقصید گوئی ہوتی رہی دعائے ترقی مال و دولت مانگی گئی، اور ممتاز فیرینی والا اپنا خوانچہ خالی کرکے خندہ پیشانی کے ساتھ سلام کرکے رخصت ہوگیا۔ اسکے چند گھنٹے بعد اس شان سے کہ ڈائننگ ہال کی کوئی گھنٹی بھی سنائی

نہیں وہی شکم سیر احباب ٹانگیں پسار کر سو گئے (رات بھر کیا واقعات پیش آئے معلوم نہیں)

صبح صادق کا ذکر کرنے سے پیشتر اس نوبت پر لکھنؤ کا تکلف والا ریل چھٹ جانے کا واقعہ یاد دلانا ضروری ہے اور اسکے بعد ناظرین اولڈ بوائے کی توجہ بچی بارک کے اُن چو گوشیہ بیت الخلاؤں کیطرف منعطف کیجاتی ہے جو ۷ سے ۸ نمبر کے کمروں کے مقابل دو باغیچوں کے بیچ میں قائم ہیں صبح ان باغیچوں کیطرف چل پہل ہونے لگی صاحبزادے صاحب بھی مع احباب کے لوٹا لیکر پہونچے۔ مگر بدقسمتی سے چاروں بیت الخلا بند پائے۔ "جائے تنگ است مرداں بسیار" کا مضمون تھا انتظار کی شدت بڑھتی جاتی تھی کہ اسی درمیان میں صاحبزادے صاحب اور انکے رفیق نے مشرق رویہ بیت الخلا کی امیدواری اسلئے منظور کی کہ امتحان بھی قریب تھا اسکی اندرونی دیواریں نسبتاً صاف تھیں۔ اور شرطیکہ بعض اقلیدس کی شکلیں دیواروں پر پنسل سے بنا کر حل کرنیکا اچھا موقع ملتا تھا۔ بدقسمتی سے اسی بیت الخلا میں بھی ایک ایسے صاحب رونق افروز تھے جو ثابت قدمی اور استقلال کے اعتبار سے ایسٹ انڈیا کمپنی سے کم نہ تھے، اور مستحکم قبضہ کئے ہوئے تھے۔ بعد انتظار شدید و مدت مدید در اجابت وا ہوا تو دونوں امیدواروں میں تکلفانہ مراسم بھی شروع ہو گئے۔ بڑی دیر تک تبادلۂ خیالات ہوتا رہا۔ گاندھی جی کا خلوص مسلمہ ہے لیکن ان دونوں حضرات نے جس اخلاص سے مراسمانہ تکلف کو ادا کیا وہ بھی قابل صد آفرین تھا۔ ایک دوسرے سے یہی کہتا تھا کہ "آپ ہی پہلے تشریف لیجائیے تکلف نہ فرمائیے" صاحبزادے صاحب اپنی ہر دلعزیزی کے شوق کی حد تک ایثار پر تلے ہوئے تھے۔ دیر تک بحث ہوتی رہی مگر کسیطرح یہہ قضیہ طے نہوا اخلاق میں طرفہ زیادتی ہونے لگی اور اس مقابلہ کی نوبت آئی کہ کون فتح پاتا ہے اور کسکی شکست ہوتی ہے۔ نوبت بانیجا رسید کہ صاحبزادے صاحب کی دستگیری کیلئے قدرت کو مداخلت کرنا پڑا بعدہ الحمد للہ صاف ہو گیا ـــــ یہہ فرما کر نیچے گردن کئے ہوئے شرماتے ہوئے آہستہ خرامی سے اپنے کمرہ میں واپس گئے اور داخل ہوکر دروازہ بند کر لیا۔ اسکے بعد صحیح طور پر خدا جانے کیا ہوا لیکن قیاس یہی چاہتا ہے کہ کپڑے بدلے گئے ہونگے۔

نثر نگاری کا میں بہت کم مرتکب ہوا ہوں اسدفعہ تعمیل کر دیگئی ہے آئندہ اگر منظر بھائی کو ضرورت ہو تو مصرعہ ذیل پڑھکر حاجت رفع فرما لیا کریں ۔ ۔ ہر روز عید نیست کہ حلوہ خورد کسے ۔

وفا

ہمارا کالج

۱ ۔ علیا حضرت بیگم صاحبہ بھوپال کے پرائیوٹ سکرٹری نے ذریعۂ پیام برقی پریس کو مطلع کیا ہے کہ ورعلیگڈھ مُسلم یونیورسٹی کے کاروبار کے متعلق جو کمیشن مقرر کیا گیا تھا، اور اُس نے جو رپورٹ پیش کی تھی، اس کو علیا حضرت بیگم صاحبہ بھوپال امیر جامعہ (چانسلر) نے بہت ہی غور کے ساتھ تمام و کمال پڑھا، اب ضرورت اسکی ہے، کہ عہدہ داران یونیورسٹی بھی اس رپورٹ پر غور کریں، کیونکہ یہہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جن لوگوں کے ہاتھوں میں یونیورسٹی کے متعلق انتظامات ہیں ان کو بھی موقع دیا جائے کہ غور و خوض کے بعد وہ بھی اس معاملہ میں اپنی رائے ظاہر کرسکیں ۔ اسلئے نائب امیر جامعہ (وائس چانسلر) ضروری کارروائی کر رہے ہیں کہ جیسے ہی عہدہ داران یونیورسٹی اس باب میں غور کریں، ایک جلسہ طلب کیا جائے جس میں ان عہدہ داروں کو بھی شریک کیا جائے ۔ اس رپورٹ پر علیا حضرت امیر جامعہ کے خیالات، اور انکی رائے، اور عہدہ دارانِ یونیورسٹی کی رائے کے ساتھ، اصل رپورٹ کو عامۃ الناس کی اطلاع کی غرض سے شایع کیا جائیگا ۔ یہہ اُمید کیجارہی ہے کہ رپورٹ اور عہدہ دارانِ متعلقہ کے آرا کی اشاعت .... کسی وقت ممکن ہوگی ۔ (رپورٹ شایع ہوگئی)

۲ ۔ برادر مکرم ڈاکٹر ضیاءالدین احمد صاحب نے، اولڈبوائے کو کر جاری کرنیکی تجویز سے اتفاق کرتے ہوئے ضروری امداد کا وعدہ فرمایا تھا ۔ پچھلے دنوں ہم نے ایفاء وعدہ کا تقاضہ کیا تو جواب میں ارقام فرماتے ہیں: "مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کے اولڈبوائے کی معاونت جیسا میرے جی میں ہے نہیں کر سکا ۔ مناسب یہہ ہوگا کہ آپ اس یونیورسٹی کے طلبا میں سے اپنے کسی شناسا طالبعلم کو اپنا نمایندہ مقرر کر دیں،

اور وہ ضروری معاونت کیلئے مجھے وقتاً فوقتاً متوجہ کرتے رہیں"! اس کام کے لئے اپنے عزیز طلبہ میں سے ہم کسی کا انتخاب کرتے لیکن ابتک جو خبریں ہم تک پہنچی ہیں ان سے معلوم ہوا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے استعفار داخل کر کے عزم سفر حج بیت اللہ فرمایا ہے۔ خدا ہمارے بھائی کا حج قبول فرمائے۔ اپنی آیندہ زندگی میں ڈاکٹر صاحب کا کیا قصد ہے ہمیں اسکی اطلاع نہیں ہوئی۔ ڈاکٹر ایل کے حیدر عارضی پرو وائس چانسلر بنائے گئے ہیں۔

۳۔ ہم یہ معلوم کر کے خوش ہوئے کہ ہمارے چھوٹے بھائیوں میں سے مسٹر سید مہربان علی صاحب متعلم ایم اے وایل ایل بی (علیگڈھ) کو رائل اکانمکس سوسائٹی لندن نے اپنا فیلو مقرر کیا ہے۔ ہمارے یہ عزیز معاشیات کی تعلیم پانے میں مشغول ہیں۔ مبارک ہو۔

برادر مخدوم و مکرم مولوی شیخ عبداللہ صاحب نے مسلم گرلس انٹرمیڈیٹ کالج علیگڈھ کے سالانہ اجلاس منعقدہ ۱۵ اپریل ۲۹ئ میں پیش کرنے کی غرض سے جو رپورٹ بابتہ ۲۸ئ تیار فرمائی ہے اسکا ایک مطلوبہ نسخہ ہمارے پاس بھی بھیجا ہے۔ یہ رپورٹ ایجنڈا کی شکل میں ہے اور اس سے علیگڈھ کی زنانہ تعلیم کے باب میں کماحقہٗ وضاحت ہوتی ہے۔ رپورٹ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ سال مذکور میں امتحان میٹرک میں اس مدرسہ کی جو لڑکیاں شریک ہوئی تھیں انکے منجملہ ایک دختر ذی اختر بیگم ہماری یونیورسٹی میں اول آکر اسی کالج میں زیر تعلیم ہیں۔ انٹرمیڈیٹ کے امتحان میں اس سال پھر ایک لڑکی شریک ہوئی تھی، اور کامیاب ہوگئی۔ مڈل کے امتحان کیلئے پانچ لڑکیوں نے کامیاب ہونیکی کوشش کی۔ ایجنڈا کے دیکھنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ درسگاہ ناکافی اسٹاف کے ساتھ چلائی جا رہی ہے اور اسکول و کالج کی چودہ جماعتوں میں ایک ایک کلاس کے لئے ایک ایک استانی بھی نہیں ہے۔ ہیڈ مسٹرس کی سعی قابل شکرگزاری ہے کہ اپنے وقت کا زیادہ حصّہ درسگاہ کے کاموں پہ صرف کرتی ہیں۔ اور اس اچھی مثال نے دوسری معلمات میں تازہ روح پیدا کردی ہے۔ آمدنی اکیس ہزار چھ سو بانوے روپیہ ہے اور اسکے مقابلہ میں مدِ نظر خرچ تیئیس ہزار تین سو ستاسی روپیہ۔ اسیطرح وظائف فنڈ کی آمدنی ایکہزار نوے روپیہ ہے، اور خرچ سولہ سو چھپن۔ زنانہ تعلیم سے دلچسپی رکھنے والے حضرات اس موقع پر اپنی دریا دلی کو کام میں لائیں۔ ہم شیخ صاحب اور

ساتھ ہی انکی بانوئے محترمہ کے اسلئے زیادہ منت پذیر ہیں کہ ایک ہی مقصد اور ایک ہی کام کیلئے ان کے وقت کا زیادہ حصّہ صرف ہوتا ہے، اور اسطرح یہ دونوں نے ملک کے گوشہ گوشہ میں اپنے ہمدرد ......ن پیدا کرلئے ہیں ۔

پچھلی ولایتی ڈاک سے ہمیں جو خطوط وصول ہوئے ہیں ان میں ایک تو برادرم مسٹر حضور عالم کا خط ہے، اور دوسرا اخی مسٹر سید محمد طاہر رضوی کا ۔ آخر الذکر نے ہمیں ہدایت فرمائی ہے کہ ہم اولڈبوائے اُن کے لندن کے پتہ پر جاری کردیں ۔ البتہ برادرم حضور عالم صاحب نے اپنے حالات کو وضاحت سے بیان کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ "کالج پہنچتے ہی علی باباکے چالیس سواروں (؟) میں داخل ہوگیا تھا ۔ آخر تک ساتھ دیا ۔ ..... بعد کو پھر پلٹن کی سرداری نصیب ہوگئی تھی"۔ اپنے زمانہ کے اہم واقعات میں تحریر فرماتے ہیں: "۱۹۲۱ء کی وہ ہڑتال جب کہ ڈائننگ ہال ہفتوں بند رہا، میری ہشت سالہ زندگی کے اہم مگر دلچسپ واقعات میں ہے ۔ انشاءاللہ کبھی فرصت میں (اس کی کیفیت) مفصل لکھوں گا، بشرطیکہ بھائی آفتاب اور بھائی حاذق برا نہ مانیں"۔ ہمیں امید ہے کہ برادرم حضور عالم بلاپس وپیش ان دلچسپ واقعات کو ہمارے حوالہ فرمادینگے۔ ہمارے بھائی کا قصد ہے کہ چھ مہینے انگلستان میں بسر کرکے، سال بھر کیلئے جرمنی جائیں، اور پھر چند ماہ امریکہ میں بسر کریں ۔ ان مقامات پر ان کا مطالعہ جرم اور جرمی اشیائے متعلق ہوگا ۔

برادرم حافظ منظور احمد صاحب (سہارنپور) ہم سے دریافت فرماتے ہیں کہ "کہو تو سہارنپور کے اولڈبوائز کی فہرست بھیجدوں"۔ حافظ صاحب اپنے قصد کو ضرور پورا کریں، اور جو بھائی اب تک خاموش رہے ہیں، وہ بھی اپنے اپنے مقام کے "اولڈ" وں کی فہرست ضرور بھیجدیں ۔

یہ خبر ہمارے لئے فکر سے خالی نہ تھی کہ برادر مکرم میجر سعید محمد خاں صاحب کے فرزند اکبر میاں اقبال سلمہ کو موٹر سے سخت چوٹ آئی، اور جبڑے کی ہڈی ٹوٹ گئی لیکن خدا کا شکر ہے کہ مریض کا مزاج اب روباصلاح ہے ۔

اولڈ بوائز

حیدرآباد میں رائٹ آنریبل لارڈ ہیڈلے کی تشریف فرمائی سے تعلق بہت سے تفریحی مشاغل انجام پذیر ہوئے۔ انکے منجملہ برادر محترم نواب رفعت یار جنگ بہادر اور برادر کرم مولوی سید مظہر اللہ صاحب کے افطار صوم کو خصوصیت خاص حاصل ہے لیکن سب سے زیادہ مفید کام یہہ ہوا کہ مسجد نظامیہ لندن کے لئے ایک رقم کثیر کا انصرام اس خیر البلاد سے ہوگیا حضور پرنور نے اس کارخیر میں اپنی جانب سے پانچ لاکھ روپیہ عطا فرما کر متوسلین دولت سے یہہ خواہش ظاہر فرمائی کہ باقی رقم کی فراہمی کا انتظام بھی ممالک محروسہ سے ہوجائے تو خوب ہے۔ اپنے آقائے ولی نعمت کی اس خواہش کی تکمیل بطیب خاطر مہاراجہ سر یمین السلطنت بہادر، نواب فخر الملک بہادر، اور نواب ولی الدولہ بہادر نے پانچ پانچ ہزار روپیہ عنایت کر کے فرمائی۔ دوسرے عمائد و معززین سے اس کار خیر میں مدد لینے کی غرض سے جو کمیٹی زیر صدارت برادر محترم نواب فخر یار جنگ بہادر قائم کی گئی ہے، اس میں فرزندان علیگڈھ کا ہاتھ بھی کام کر رہا ہے۔ برادران نواب رفعت یار جنگ بہادر، نواب عابد نواز جنگ بہادر، مولوی محمد اصغر صاحب، مولوی احمد محی الدین صاحب، مولوی سید عسکری حسن صاحب، ڈاکٹر حامد علی صاحب، اور مولوی مظہر اللہ صاحب کے نام مجلس انتظامی میں شریک ہیں، اور یہ حضرات دلبستگی کے ساتھ فرائض کمیٹی کو انجام دیتے ہوئے پائے جاتے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ اس کام میں لارڈ ہیڈلے کو خاطر خواہ کامیابی ہوگی اور پندرہ لاکھ کے منجملہ جو رقم باقی ہے، وہ بھی ممالک محروسہ ہی سے فراہم کی جائے گی۔ لارڈ صاحب اب حیدرآباد کو خدا حافظ کہہ چکے ہیں، باوجود اسکے ہمیں امید ہے کہ کام تیزی کیساتھ جاری رہے گا۔ (دوسرے شرکا کے نام آئندہ درج ہونگے)

ماہ مبارک رمضان میں ہمیشہ عبادت کی بہار ہوتی ہے اور مسلمانوں کا ایک حصہ کثیر روزہ نماز میں اپنے

وقت کا بیشتر حصہ صرف کیا کرتا ہے بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جو اس سال روزہ کھا کر اگلے سال کے دغدغے میں پڑے رہتے ہیں جیسا کہ ہمارے ایک شاعر نے کہا ہے ؎

مرے اس لئے ہیں یہ سب آہ و نالے   کہ یہ پھر بھی ہیں پار سال آنیوالے

مبارک ہیں وہ ہستیاں جو وقت کو ضائع ہونے نہیں دیتیں۔ اسی اصول کو پیش نظر رکھ کر ہمارے فوجی بھائیوں نے اس مرتبہ غیر معمولی دلبستگی کا اظہار فرمایا ہے۔ فرسٹ، سکنڈ، اور تھرڈ لانسر میں جہاں کرنل قادر بیگ، کرنل عظمت اللہ، اور میجر عبد الصمد جیسے دل زندہ رکھنے والے خوش سلیقہ حضرات موجود ہوں اور جن کے ساتھ علیگڈھ کے کھلنڈروں کی کافی تعداد موجود ہو، وہاں مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی کے مواعظ کامیاب ثابت ہوں تو ہمارے لئے تعجب کی کوئی گنجائش نہیں۔

کہتے ہیں کہ برادر عزیز مسٹر مرزا اسحاق بیگ پر حال ہی میں ڈگری ہوئی ؛ یا بالفاظ دیگر انکے گھر میں لڑکی پیدا ہوئی ہے۔ خدا انہیں مبارک کرے۔ اس ولادت پر برادر محترم سید عبد الرحمن صاحب ہارٹی دلی سپاس قبول فرمائیں باپ کو بالکل خالی پیٹ نہیں دیتے۔

برادر عزیز مسٹر صدیق الزماں کا تبادلہ صوبہ اودھ ۔ ناو ... صوبہ سیدک کو ہونے کی اطلاع ہمارے پاس آئی ہے ہمارے دل سے تو یہ پہلے بھی قریب تھے جسم سے بھی قریب ہوگئے ہیں۔ اولڈبوائے کے ہر صیغہ میں مسٹر صدیق الزماں نے اتنا کام کیا ہے کہ اس موقعہ پر ہم ان سے بھائی گے کتابوں کی فرمائش نہیں کر سکتے۔ البتہ خود انہیں کیلئے مسٹر احمد الدین سے فصل کی چیز کی فرمائش ہے، جس کا لطف وہ کنڑہ ضلع اورنگ آباد سے عالم پور ضلع رائچور پہنچ کر اٹھار ہے ہونگے۔ یہ بھائی اگر عالم پور کا تحفہ کسی کو روانہ بھی کریں لیکن گزرگیری بلدہ میں مسٹر علی حسین بلگرامی کی گرفت سے کوئی پارسل بچ نہیں سکتا۔ ہمارے ان بھائی کا تبادلہ ویجاپور ضلع اورنگ آباد سے حیدرآباد کا ہوگیا۔

سرہارکورٹ بٹلر کا نام ہندوستان کے تمام تعلیم یافتہ گھروں میں پہنچ چکا ہے مسلم یونیورسٹی کی بنا قائم کرنے کے زمانہ میں وہ وائسرئیگل کونسل کے رکن اور ہماری اس تحریک کے ساتھ بڑی سرگرمی کا اظہار کرنیوالے لوگوں میں تھے۔ پھر صوبہ متحدہ کے گورنر کی حیثیت سے انھوں نے علیگڈھ کے ساتھ اپنی دلبستگی کا اظہار فرمایا

وزارتی برما کی مدت ختم کر کے کمیٹی ریاستہائے ہند کے صدر نشین مقرر ہوئے اور اسی سلسلہ میں حیدر آباد آئے ہوئے۔ مکرم نواب مسعود جنگ بہادر نے اُن سے انجمن ترقی اردو کی رفتار ترقی کا ذکر فرمایا۔ سرہارکورٹ اردو کے بڑے حامی ہیں۔ تیز اسلئے اس زبان کیساتھ اپنے میلان طبع کے اظہار کی خاطر انھوں نے انجمن کو مبلغ پچاس روپیہ کا عطیہ نواب مسعود جنگ کے ذریعہ سرفراز فرمایا۔ دوسرے عطایا کے ساتھ یہ سلیہ اگر اپنے جائز مصرف میں آئے، تو ہمیں بڑی خوشی ہوگی۔

کھانے کے باب میں ہمیں اپنے ان بھائیوں سے کامل اتفاق ہے جو بھوک کے وقت، کہیں ملے، مصروفیت، ٹوٹ جایا کرتے ہیں۔ اسمیں اپنے اور غیر میں تمیز بیکار ہے، مگر کھانا ہضم کرنے کیلئے تھوڑی ورزش ضروری ہے۔ اس تھوڑی سی تمہید سے ہماری غرض یہ نہیں ہے کہ ہم اپنے محترم مولوی محمد حقیب صاحب سے دریافت کریں کہ انھوں نے نئی دلّی میں کس کے ساتھ کھانا کیوں کھایا؛ بلکہ ہم اُن کو اصول حفظان صحت کے ساتھ یاد دلانا چاہتے ہیں کہ کھانا ہضم کرنے کی فکر سے غافل نہ رہیں۔ برادرم توم براہ کرم ہاضمہ کا چورن آدھے پیسہ کا ٹکٹ بھیج کر ہم سے منگالیں، البتہ اولڈ بوائے کی خاطر دماغی ورزش کے لئے، خود اپنے کمرہ میں اپنی کرسی پر بیٹھے بیٹھے تیار ہو جائیں، اور جناب نیاز مند کی دماغ سوزی پر خود بھی تھوڑی سی خامہ فرسائی فرمانے کی تکلیف گوارا فرمائیں۔

تھیاسوفیکل سوسائٹی حیدر آباد میں مختلف اقوام و ملل کی خواتین کے سامنے، روزہ کی حالت میں مولانا شوکت علی صاحب نے ایک لمبی چوڑی مگر اثر خیز تقریر کی، اور اس کو افطار کے بعد اپنے دوستوں میں دہرایا۔ مطالب بہت خوب تھے، اور ان میں شوکت علی کی زبان نے چٹخارہ پیدا کر دیا تھا۔ اسی سلسلہ میں فرمانے لگے کہ "میں عورت ہوتا تو اس ڈیل ڈول کے ساتھ مجھے کون قبول کرتا"؟ اسپر دوستوں کی صف سے ایک فرشی قہقہہ پڑا، اور یہ سوال حل ہونے کی غرض سے زیر بحث آگیا۔ ہم تو یہ جانتے ہیں کہ شوکت علی، مسٹر شوکت علی، اور مولانا شوکت علی کے چاہنے والے ہمیشہ ہر حصہ ملک میں موجود پائے گئے ہیں۔ زنسکو ایک طرف، خود اپنے ہی ملک میں اگر ایسا کوئی سوال اٹھتا تا، اور اب تو بین الملی شادیوں کیلئے بہت سے ہندوستانی خواہش مند پائے جاتے ہیں کبھی کیکر سنگھ کو اٹھا کر لوگ امیدواری کے لئے کھڑا کر دیتے۔ اس سے قطع نظر کیجائے تو بھی مرد کی چٹکی ایسی ہے کہ ایک زبردست عورت کا

کا بھی تیا پانی کردیتی ہے۔ ہمارے لکھنڈروں میں سے کوئی صاحب مولانا کے اس سوال کو حل فرمادیں گے تو ہم مع اپنے ناظرین کے، اُن کا بابت بہت شکریہ ادا کریں گے، اور بنارس سے رس گلے منگا کر انکے نام پارسل کردیں گے۔ شرط یہ ہے کہ مسٹر کوجی راؤ اور مس طر کا نام درمیان میں نہ آئے، جن کی شادی ۷ ار مارچ کو بڑودا میں ہونی ہے۔ یہ مس صاحبہ بغیر گائے کا گوبر اور پیشاب پئے ہوئے اشد ہو گئی ہیں۔

عہدہ داران مافوق کے لمبی رخصت لینے کے باعث، ہمارے بھائیوں میں سے مسٹر سید اصغر حسین کو سشن ججی گونڈہ پر، مسٹر سید اعجاز علی کو ڈپٹی کمشنری سلطانپورہ پر، اور مسٹر خورشید احمد خاں کو ڈپٹی کمشنری پرتاب گڑھ پر ترقیاں ملی ہیں۔ خدا کرے یہ سب اپنی اپنی جگہ مستقل ہو جائیں۔ ان بزرگواروں کو ضلعے ایسے ملے ہیں کہ ہم کوئی فرمایش بھی نہیں کر سکتے۔

برادران رضا نواز جنگ بہادر و سید علمدار حسین صاحب کا ہم سب کو شکر گزار ہونا چاہئے کہ اولڈ بوائے اُن کے ہمراہ بہشت ۱۳۳ف میں چوک اور نگ آباد کی دکانوں میں آگ لگنے کے موقعہ پر اپنی ذات سے اُس کے فرو کرنے میں حصّہ لیا۔

حال ہی میں مصالحت پر ایک مقدمہ کا تصفیہ، حیدر آباد ہائیکورٹ میں ہوا ہے۔ گلبرگہ شریف کے متعلمین و وکلا، کے درمیان، نزاع لفظی پر، اسکی ابتدا گلبرگہ ہی کے عدالتوں سے ہوئی تھی، مگر دونوں کی خودداری اور ضد کے باعث مقدمہ کا تصفیہ، ایک مدت کے بعد اب ہوا۔ مدعی و مدعا علیہ دونوں جماعتوں میں اولڈ بوائز موجود تھی، ان دونوں کے پیروکار وکلا میں بھی اولڈ بوائز شریک غالب تھے، اور قبول کر لیتے تو اجلاس پر بھی ایک اولڈ بوائے، آنریبل ڈاکٹر ناظر یار جنگ بہادر ہوتے۔ انکے بجائے آنریبل نواب ہاشم یار جنگ بہادر کے اجلاس پر مقدمہ چلتا رہا، اور وہیں ہز اکسلنسی مہاراجہ سرکشن پرشاد یمین السلطنتہ بہادر کے ارشاد پر مصالحت ہوئی۔ ہم کو ہز اکسلنسی کی اس مال اندیشی اور خیر طلبی کا اعتراف ہے، اور خدا کا شکر کرتے ہیں کہ دونوں تعلیم یافتہ جماعتیں مقدمہ بازی کے مہلکہ سے بچ گئیں۔

مولوی احسان اللہ صاحب عباسی چریا کوٹی، وکیل گورکھپور، ہمارے اسکول کے ان فرزندوں میں سے تھے۔ جن کو ابتدائے قیام کے وقت شرکت کی عزت نصیب ہوئی تھی۔ ہمارے ان بھائی نے ۱۰ ماہ رمضان

کو دن کے ایک بجے اس خاکدان عالم کو چھوڑا۔ مرحوم ایک نامور وکیل، ایک باعمل عالم، اور ایک شہرۂ آفاق مصنف تھے، اور اپنی زندگی کی ابتداء سے آخر تک ان میں سے ہر ایک صنف میں وابستگی کے ساتھ کام کرتے رہے۔ ہم مرحوم کیلئے دعاء مغفرت کرتے ہیں اور اُن کے پسماندوں کے ساتھ اپنی دردمندی کا اظہار کرتے ہیں۔

برادر عزیز مسٹر سید محمد جواد (محبوب نگر) کی ترقی اور شادی کے سلسلہ میں انکے بہت سے عزیزوں اور دوستوں نے کھانے پینے کی باتیں کیں۔ مکرمی مولوی سید علی اکبر صاحب صدر مہتمم تعمیرات ضلع محبوب نگر نے بھی گلپوشی کی رسم ادا کر کے اپنی برادرانہ محبت کا ثبوت دیا تھا۔ اس موقع پر مستقر ضلع کے تقریبًا تمام بھلے آدمی شرکت کرنے آئے تھے۔ جناب عیش بھی ان مہمانوں میں تھے۔ میزبان کا سن پچاس کے لگ بھگ ہے، اور اس عمر میں خدا نے انکو بھی فرزند کی نعمت سے برومند فرمایا ہے۔ مہمانوں کی پذیرائی کرنے کی غرض سے سید علی اکبر صاحب گھر سے باہر تشریف لائے تو گود میں بچہ بھی تھا۔ جناب عیش سے خاموش نہ رہا گیا، فورًا محفل کی ضیافت طبع

"Gentleman, too late!"

کے چست فقرے سے کر ڈالی۔

نواب ارسطو یار جنگ بہادر کا نشتر، حیدرآباد کیا، دور دور مشہور ہے۔ انگریز جراحوں نے بھی اس نشتر کا لوہا مان لیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے تقریبًا پون درجن بچوں میں سے دو کو علیگڈھ کے حوالہ کیا تھا اور اب یہ سرکار آصفیہ کے صیغۂ زراعت و عدالت میں مفید عہدہ دار ثابت ہو رہے ہیں۔ برادرم مولوی مظہر حسین صاحب ناظم زراعت، اور مولوی فدا حسین صاحب منصف کو اب بھی کبھی کبھی علیگڈھ کی یاد آجاتی ہے۔ آخر الذکر حال ہی میں سفر عتبات عالیات سے مع الخیر واپس تشریف لائے ہیں اور اپنی خدمت پر رجوع ہو چکے ہیں۔ اس قافلہ میں نواب صاحب ممدوح بھی مع ایک کنبہ کے شریک سفر تھے۔ ہم اپنے بھائی کا خیر مقدم کرتے ہیں۔

برادرم مسٹر مسعود علی نے اپنے بچے اصغر مسعود کے عقیقہ میں باقر خانیوں کی تقسیم کی۔ دفتر اولڈبوائے کو بھی ان دو ڈھالوں کا حصہ روانہ فرمایا تھا۔